itsurdu.blogspot.com
آتش رفتہ کا سراغ
3
مشرف عالم ذوقی

حصہ سوم

"آبِ روانِ کبیر، تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب"

—اقبال

(۲۰۱۰ سے مسلسل......)

(۱)

میں ارشد پاشا...... میں واپس اپنی دنیا میں لوٹنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ دھماکے میرا راستہ روک لیتے ہیں......

اٹھارہ برسوں کے طویل سفر کے بعد بھی جیسے وہ دھماکے مجھ میں ابھی ابھی زندہ ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ میں ان دھماکوں سے کبھی باہر نہیں نکل سکا۔ ابا حضور تغلق پاشا اور بی اماں کی کہانیاں وقت کی قبروں میں دفن ہوگئیں۔ اب بھی آسمان پر کوے شور کرتے ہیں تو بادلوں کے درمیان سے بی اماں کا جھریوں بھرا چہرہ سامنے آجاتا ہے— اور دمہ کے مریض تغلق پاشا کا سہما ہوا چہرہ......

کتنے پاکستان—؟ یہ ہمارے رہنما اور کتنے پاکستان بنائیں گے؟ ایک پاکستان کو روتے ہوئے بدنصیب زندگی ختم ہوگئی۔ اور یہ...... ان کی زہریلی زبان کو نفرت اور تقسیم کا ذائقہ لگ چکا ہے...... خدا جانے آگے کیا ہوگا۔ لیکن ہم تو نہیں ہوں گے، آگے آنے والے پرآشوب موسم کا مرثیہ پڑھنے کے لئے — لیکن تم تو ہوگے نا......؟ تمہاری نسل ہوگی۔

اس سناٹے سے باہر نکلتا ہوں تو وحشت کا چہرہ میرا راستہ روک لیتا ہے۔

میڈیا ایک بار پھر کرنل روہت، مرگیہ اور ابھے کار دوبے کی رپورٹ کو دبانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

رباب، شمیمہ کو لے کر پریشان تھی۔ لیکن اب آنندی کی وجہ سے وہ ایک بار

[illegible]

تھی۔ جیسے اس نے تھاپڑ کے بارے میں انکشاف کیا۔

'وہ ویسے نہیں ہیں جیسے نظر آتے ہیں —'

مطلب —؟ رباب نے حیرانی سے پوچھا۔

'اندر سے بہت سخت ہیں۔ غصہ آجائے تو پھر ہوش میں نہیں رہتے۔'

'بھائی صاحب ایسے تو نہیں لگتے۔'

'نہیں لگتے تو کیا۔ ہر مرد ایک جیسا ہوتا ہے۔'

رباب نے بات کاٹ دی — 'نہیں یہ تو ایسے بالکل نہیں ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی غصہ مجھے ہی آتا ہے۔ لیکن یہ خاموش رہتے ہیں۔'

ان دو برسوں میں بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی کہانیوں پر دھند چھا گئی تھی — مگر کسی نہ کسی بہانے یہ معاملہ پھر سے زندہ ہو جاتا تھا۔ ایک دن اچھے کمار دوبے کی بھی خبر آگئی۔ انہیں جیل میں ہی زہر دے دیا گیا تھا۔ پولس انوسٹیگیشن میں دونوں باتوں پر غور کیا جا رہا تھا کہ یہ خودکشی ہے یا پھر قتل کی سازش — کیونکہ دوبے پولس دباؤ میں اپنا اقبالیہ بیان درج کرا چکے تھے۔ پولس کو اہم سراغ ملے تھے۔ لیکن یہ اہم سراغ کیا ہیں، اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔

مرنے سے کچھ روز پہلے کورٹ لے جاتے ہوئے میڈیا نے ان کا ایک انٹرویو بھی ہائی لائٹ کیا تھا۔

''میں سنگھ کا آدمی ہوں۔ اور سنگھ کا آدمی کہاں نہیں ہے — ہوسکتا ہے جو آدمی آپ کو تسلی اور دلاسہ دے رہا ہو، وہ بھی سنگھ کا ہی آدمی ہو۔ جو آدمی آپ کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہو، وہ بھی سنگھ کا آدمی ہو — جو آدمی آپ کے گھر کا نوکر، خدمتگار، یا گھر ا

وہ کسی بھی لباس میں، کسی بھی روپ میں آپ کے پاس ہوسکتا ہے — اور آپ اسے پہچان بھی نہیں پائیں گے۔'

میں ارشد پاشا...... میں واپس اپنی دنیا میں آگیا ہوں۔ یہاں سہمی ہوئی رباب کا چہرہ ہے، جو مجھے بغور دیکھ رہی ہے۔

'تم اجودھیا جا رہے ہو نا......؟'

'ہاں۔'

'تھاپڑ بھائی بھی —؟'

'میں نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ ساتھ چلنے پر بضد ہے۔'

'یہ تو اچھی بات ہے۔'

'میں اسے اکیلا ہی تلاش کرنا چاہتا ہوں۔'

میری آنکھیں سوچ میں ڈوبی تھیں — 'تھاپڑ کب تک میرا ساتھ دے گا۔ اور کہاں تک ساتھ دے گا۔'

'مگر اس میں نقصان کیا ہے؟'

'نقصان کچھ نہیں۔ اس کی بیوی ہے۔ بیٹا بھی ہاسٹل سے آیا ہوا ہے۔'

'لیکن تھاپڑ بھائی کو تم تو زور نہیں دے رہے ہو — وہ خود ہی جانا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔'

رباب کی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں —

'بس۔ اس بار میرا بیٹا مل جائے۔ اسامہ واپس آجائے۔ پھر ہم یہ علاقہ چھوڑ دیں گے۔'

کل صبح ہم دونوں کو فیض آباد کے لئے ٹرین پکڑنی تھی۔ وہاں سے اجودھیا۔ اور پھر ٹھہر کر ہری دوار ہوتے ہوئے دلّی واپس آنا تھا۔ یہ سب کچھ مایوسی میں چراغ جلانے جیسا تھا— مگر یہ اسامہ کی تلاش کا معاملہ تھا۔ اور اس معاملہ میں، میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

●●

فیض آباد ریلوے اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ مسافروں سے زیادہ تعداد اس وقت وہاں بندروں کی تھی۔ جوتا پالش کرنے والا بچہ زور زور سے ہنس رہا تھا—

'ڈریے مت کچھ نہیں کریں گے یہ۔'

تھاپڑ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

' بندروں سے ڈر تو نہیں لگ رہا۔'

' نہیں۔ اب انسانوں سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔'

جوتا پالش کرنے والا بچہ بندروں کو دیکھ کر انہیں بھگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

' یہاں سب رام بھکت ہیں۔ یہ بندر بھی۔ کیلے کھاتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں پر چشمہ ہے تو چشمہ بچا کے چلیے۔ یہ چشمہ اتار لیتے ہیں۔ ساتھ میں کھانے پینے کے سامان ہوں تو لے کر بھاگ جاتے ہیں۔'

' سنا۔ رام بھکت ہیں— تھاپڑ پھر ہنسا— ان رام بھکتوں نے جو دیش میں تباہی مچائی، اس سے رام کا دل بھی رو رہا ہوگا۔'

فیض آباد اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بعد ہم ٹیمپو والوں کی طرف بڑھے۔ ایک

'اجودھیا...... اجودھیا چلو......'

یہاں کی فضا میں ایک عجیب سا سناٹا چھایا تھا— گرد آلود سڑکیں۔ سڑک پر ٹریفک شروع ہو گیا تھا۔ گاڑیوں کے ہارن چیخ رہے تھے۔ لیکن ان سب سے بے نیاز میں صرف اسامہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اجودھیا...... ہری دوار...... پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔؟'

کیا سوچنے لگے...... تھاپڑ نے پلٹ پر پوچھا۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

' اسامہ کے بارے میں سوچ رہا تھا— کیا سچ مچ وہ اجودھیا آیا ہوگا۔ اگر ہاں تو کیوں؟ ہندستان میں اتنی ساری جگہیں ہیں۔ پھر اجودھیا ہی کیوں...... اگر وہ آیا— تو کوئی نہ کوئی مقصد تو ضرور ہوگا۔'

'ہونہہ۔' تھاپڑ نے میری طرف دیکھا۔ 'میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ خیر، کوئی نہ کوئی سراغ تو اس کے بارے میں ملے گا ہی۔'

اجودھیا کی تنگ گلیاں رام بھکتوں سے روشن تھیں۔ جہاں سے بھی نکلیے...... جے شری رام کی آوازیں۔ مندروں سے، لاؤڈ سپیکر سے بجتے ہوئے بھجن...... عقیدت مندوں کا ہجوم...... بھیڑ بھاڑ والے علاقے سے ہوتے ہوئے ہم ہنومان مندر اور سیتا رسوئی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں قدم قدم پر پولس چوکی بھی تھی۔ ہماری آنکھیں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسامہ کی عمر کا کوئی بچہ نظر آتا تو ٹیس کی ایک لہر بدن میں سرایت کر جاتی......

'یہاں نو عمر سادھو بھی تھے جو بھگوا کپڑوں میں آتے جاتے ہوئے ہمیں دیکھ کر زور سے جے شری رام کہتے۔

مگر سوال یہ تھا کہ اسامہ کے بارے میں یہاں کس سے پوچھا جائے
اور جس سے پوچھا جائے، کیا وہ مشکوک نگاہوں سے ہماری طرف نہ دیکھے گا — تھاپڑ میری کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے کو ہلایا —

'پریشان مت ہو۔ پہلے کچھ دیر اسے خود تلاش کرتے ہیں۔ پھر آگے جو ہوگا دیکھیں گے —'

میں کچھ نہیں بولا۔ سامنے سے سادھوؤں کی ٹولی شنکھ بجاتی اور ہوا میں گلال اڑاتی ہوئی آرہی تھی — ہاتھوں منجیرے بھی تھے۔ یہ نظارے اجودھیا کے گلی کوچوں میں عام ہیں —

●●

دھول اڑنے لگی تھی ......

مندروں سے ٹھہر ٹھہر کر گھنٹیوں اور شنکھ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

سیتا رسوئی سے آگے بڑھنے پر تھاپڑ نے ایک کرتا پائجامہ پہنے ہوئے شخص کو روکا۔ اس نے اپنا نام امام بخش بتایا۔ وہ یہیں، مدتوں سے اجودھیا میں ہے۔ میں نے اسامہ کی تصویر دکھائی — اس نے ناامیدی میں سر ہلایا۔ تصویر میں نے دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ امام بخش نے کئی دلچسپ باتیں بتائیں۔ جیسے یہ کہ وہ کنٹھی مالا بناتا ہے۔ یہ اس کا پشتینی کاروبار ہے۔ اس کاروبار میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ عام طور پر یہاں کے سادھو گلے میں اس کی ہی کنٹھی مالائیں پہنتے ہیں۔

امام بخش ہنسا —

''مندروں میں پھول کا چڑھاوا ہوتا ہے۔ پھول کے کاروبار میں بھی مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ صبح ہوتے ہی پھول لے کر مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ جائیں گے —

جیسے یہاں کے سادھو سنت کھڑاؤں پہنتے ہیں۔ کھڑاؤں کو پاؤں میں پہننے کے لئے شدھ مانا جاتا ہے۔ اور یہ کاروبار بھی زیادہ تر مسلمانوں نے سنبھال رکھا ہے۔ لوگ مندر، مسجد کے لئے لڑ رہے ہیں اور یہاں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے کھڑاؤں بڑے آرام سے وہ پاؤں میں ڈالتے ہیں۔ پھول چڑھاوے پر چڑھ جاتے ہیں اور کنٹھی مالا گلے میں پہنتے ہیں۔'

'یہاں کے حالات ......' تھاپڑ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پھسپھساتے ہوئے پوچھا۔

'کبھی کبھی بگڑ جاتے ہیں۔ لیکن ان میں باہر والوں کی تعداد زیادہ ہے۔'

'مطلب؟'

'یہاں اب بھی بھائی چارہ ہے۔ دونوں قوم کے لوگ ایک دوسرے کی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہیں۔'

امام بخش آہستہ سے بولا — 'اب تین مہینے پہلے ذرا حالات بگڑ گئے — باہر سے کچھ لوگ آئے تھے۔ پولس والے بتاتے تھے کہ وہ مندر کو تباہ کرنے آئے تھے...... دو گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں۔ راکٹ داغے گئے۔ یہ سب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ان واقعات سے مسلمان ڈر جاتے ہیں — تب بھیانک آوازیں ہوتی ہیں۔ اب تو ہم عادی ہوگئے ہیں۔ بیس سال سے زیادہ ہوگئے۔'

امام بخش نے ٹھنڈی آہیں بھریں — 'بس کبھی کبھی پرانے زخم تازہ ہوجاتے ہیں۔ مندروں کے سائے میں ہم نے زندگی گزاری۔ رزق بھی یہیں سے ملا۔ جب بابری مسجد توڑی گئی تھی۔ ہمارے بھی گھر جلا دیئے گئے تھے۔ کتنے ہی مسلمان یہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن ہم نہیں گئے۔ کہاں جائیں باپ داداؤں کی وراثت کو

میں تھی کہ چپ رہیں۔ بولنے سے فائدہ بھی کیا تھا [illegible] پہلے ایسا نہیں تھا۔ لیکن [illegible] ہوئے حالات میں...... یہاں والوں کی نظریں بھی بدلنے لگی تھی۔

تھاپڑ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا— 'اچھا' یہاں اجودھیا میں مسلمانوں کی کتنی تعداد ہوگی؟

'مسلمان تو فیض آباد میں ملیں گے صاحب— مسجدیں بھی ملیں گی۔ یہاں تو بس یہی کوئی دو ہزار۔ سلائی، جوتے بنانا، پھول، کنٹھی مالا اور کھڑاون کے پشتنی کاروبار— مگر اب ان دھندوں میں بھی فرق آیا ہے۔ یہ بات بھی اڑائی گئی کہ مسلمان اشدھ ہوتے ہیں۔ ان سے پوجا کی کوئی سامگری نہ لی جائے۔ کچھ سادھو سنت بھلے مانس ہیں۔ وہ ان باتوں پر ہنستے ہیں۔ رام نومی کے موقع پر پچھلے اکھاڑے سے ایک رتھ نکلتا ہے۔ اس کی اگوائی بھی ایک مسلمان ہی کرتا ہے۔ برسہا برس سے— پہلے تو دونوں مذہب کے لوگ ملے ہوئے لگتے تھے۔ مگر اب فرق آنے لگا ہے۔ اچھا صاحب اب کام کا وقت ہے۔ چلتا ہوں— ' چلتے چلتے امام بخش ٹھہرا— 'رام جنم بھومی استھان سے کچھ دور پر ہی ایک خانقاہ ہے۔ کیوں نہیں، آپ وہاں جا کر پتہ لگاتے ہیں۔'

مندروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بھجن گائے جا رہے تھے۔ سادھو سنتوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔ رام جنم بھومی جانے والے راستوں پر پولس کا پہرہ تھا۔ چاروں طرف خاکی وردی نظر آ رہی تھی۔ خوف کی ایک انجانی لہر میں جسم میں محسوس کر رہا تھا۔

مگر ایسا کیوں تھا— ؟اس بات کو سمجھنے سے ذہن قاصر تھا۔ اس درمیان کئی لوگوں کو اسامہ کی تصویریں دکھائی گئیں۔ مگر ان لوگوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

...کے پہروں اور تلاشی سے گزرتے ہوئے رام جنم بھومی استھان تک جانا آسان نہیں تھا۔ اور تھاپڑ کا خیال تھا، وہاں جانے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ کیونکہ ایک تو وہاں کسی مسلمان کے ہونے کی گنجائش بہت کم— اور دوسری اہم بات، اسامہ نام تبدیل کر کے ان لوگوں میں شریک ہو، یہ ممکن نہیں— میں یہاں مسجد کے گنبد کو تلاش کر رہا تھا—

اٹھارہ سال پہلے جب میں اس مقام پر آیا تھا تب یہ گلی ویران ہوا کرتی تھی— ایک ویران مسجد، جس کے آس پاس دور دور تک آدم ذات کا نام ونشان تک نہیں۔ لیکن اب یہاں کے ماحول میں خاکی وردی اور سرہی سر نظر آ رہے تھے۔ دور آسمان پر اڑتے ہوئے کبوتر تو نظر آئے لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی اس مقام تک آنے سے کترا رہے ہوں۔

رہ رہ کر فضا میں جے شری رام کے بول ابھر جاتے— یہاں سے کچھ دوری پر ہی وہ خانقاہ تھی جس کے بارے میں امام بخش نے بتایا تھا۔ میں نے تھاپڑ سے بات کر لی تھی۔ مناسب ہوا تو رات ہم وہیں ٹھہر جائیں گے۔

یہاں ایک اداسی مجھ پر مسلط تھی۔ لیکن اس اداسی کی وجہ میرا بیٹا اسامہ نہیں تھا۔

سیتا رسوئی سے رام جنم بھومی اور وہاں سے خانقاہ کی طرف کوچ کرتے ہوئے ہم دونوں کے درمیان بے حد کم مکالے ہوئے— اب اگلا پڑاؤ خانقاہ تھا۔

آسمان پر سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کی سیاہی چھانے لگی تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ناامیدی غالب تھی۔ لیکن ناامیدی کے بطن سے ہی امید کا سورج طلوع ہوتا ہے۔

کیا اسامہ کی تلاش میں کامیابی ملے گی؟

تلاش نے ہی مجھے اب تک زندہ رکھا تھا۔

خوف اور دہشت کے گھنے سایوں کے باوجود۔

●●

'جی فرمایئے'

خانقاہ کے دروازے پر قدم رکھتے ہی ایک بھاری بھرکم آواز سے واسطہ پڑا۔

'السلام علیکم'

'وعلیکم السلام'

مصافحہ ہوا۔ یہ انظار صاحب تھے۔ صاف شفاف کرتا پائجامہ اور دو پلّی ٹوپی

قد لامبا۔ عمر بھی کوئی ۶۰ کے آس پاس۔ سوال کیا گیا۔

'کہاں سے آنا ہوا ہے؟'

'دلّی سے؟'

'یہاں قیام......؟'

'قیام کے لئے تو ابھی سوچا بھی نہیں ہے'

انظار صاحب کی مسکراتی آنکھوں نے تھاپڑ کو دیکھا۔

'یہ خانقاہ ہے۔ اب تو یہ ویران ہوگئی۔ پہلے یہاں رونق ہوا کرتی تھی۔ آپ لوگ چاہیں تو یہاں قیام کر سکتے ہیں'۔

باہر دالان میں زمین پر بستر لگا ہوا تھا۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ جگہ انظار صاحب نے مسافروں کے قیام کے لیے رکھی ہے۔ وہ ملنسار آدمی تھے — مگر تھاپڑ کی موجودگی میں وہ دل کی بات زبان پر لانے سے خوف محسوس کر رہے تھے۔ چائے اور ہلکے ناشتے کے بعد انظار صاحب نے یہاں آنے کی وجہ جاننی چاہی — میں نے تھاپڑ کی

طرف دیکھا۔ تھاپڑ نے اسامہ کی تصویر آگے بڑھا دی۔

'آپ نے دیکھا ہے اس بچے کو؟'

میں نے انظار صاحب کے چہرے کا جائزہ لیا — وہ بغور اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے آواز لگائی —

'مدومیاں'

مدومیاں گھر کے پرانے خانساماں تھے۔ ان کا تعارف کرانے کے بعد انظار صاحب نے مدومیاں سے کہا —

'لپک کر جائیو۔ اور رمتا کو بلا کر لے آؤ'

'اچھا صاحب'

مدومیاں چلے گئے۔

یہ رمتا کون ہے؟ میں نے آہستہ سے کہا۔

'چائے اور سگریٹ کی گمتی لگاتا ہے۔ خانقاہ سے بس دو قدم دور اس کی گمتی ہے'۔

'کیا بات ہے —؟' میں نے پلٹ کر انظار صاحب کی طرف دیکھا۔

'بس دو سکنڈ انتظار کر لیجئے۔ رمتا کو آنے دیجئے'

پانچ منٹ کے اندر ہی مدو بھائی اپنے ساتھ رمتا کو لے کر آ گئے — رمتا پچیس سال کا نوجوان تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پتلون۔ شرٹ۔ گیہواں رنگ۔ اور پیشانی پر چمکتا ہوا ٹیکا —

'آپ نے بلایا صاحب۔؟'

'ہائے رمتا'

'کیا بات ہے صاحب —؟' رمتا باری باری سے ہم دونوں کی طرف دیکھ

رہا تھا۔

'یہاں آکر بیٹھو۔ اور یہ تصویر دیکھ کر بتاؤ کہ کس کی ہے۔'

رمتا قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس نے تصویر ہاتھ میں لی۔ پھر مسکرا کر بولا۔

' یہ تو اپنا علوی ہے۔'

' علوی؟'

اس بار ہم دونوں چونک گئے تھے۔

انظار صاحب مسکرائے — یہ علوی ہے۔ کئی بار مجھ سے بھی مل چکا ہے۔ کمال کا بچہ ہے۔

رمتا اب ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا —

' لیکن علوی کی یہ تصویر آپ کے پاس کیسے آئی —؟'

تھاپڑ آہستہ سے بولے —' ہم اس کی تلاش میں نکلے ہیں۔'

میں نے کمزور لہجے میں کہا —' آپ لوگ اس کے بارے میں جو بھی جانتے ہوں بتایئے۔ ہماری مدد کیجئے۔'

انظار صاحب نے لمبی سانس لی —' میں نے ایسے بچے بہت کم دیکھے۔ ایسا بچہ جو دوسروں کا مزاج بدل دے۔ علوی کو جب بھی دیکھتا تھا، سوچتا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے..... کوئی تو وجہ ہوگی —؟'

' مطلب؟ '

' آپ ایک مسلم شناخت کے ساتھ ایسے لوگوں سے وابستہ ہوتے ہیں جو آپ کے ہم مذہب نہیں ہیں — دوسرے مذہب اور دوسرے عقیدے کے ہیں — اور وہ آپ کے مذہب کے ساتھ آپ کو قبول کر لیتے ہیں۔ '

اب ہم دونوں کے چونکنے کی باری تھی — تھاپڑ نے کشمکش کے لہجے میں میری

[illegible] ہوئے ان سے۔

'علوی کیا۔ ہم تو دوست تھے۔'

'دوست؟ '

' ہاں۔ وہ کوئی بات مجھ سے چھپاتا نہیں تھا — نماز بھی پڑھتا تھا۔ جہاں بھی موقع مل جائے۔ اور وہ جو اپنے بابا ہیں نا، ترلوکی بابا۔ وہ تو بہت مانتے تھے اسے۔'

''ترلوکی بابا۔ ؟'

' کہتے ہیں۔ تین لوکوں کی خبر ہے ان کو — سب ترلوکی بابا کہتے ہیں — مگر علوی نے تو ترلوکی بابا پر بھی جادو کر دیا۔'

' نہیں۔ مجھے شروع سے بتاؤ۔ علوی نے تمہیں کیا بتایا۔'

'اپنے بارے میں تو کچھ نہیں صاحب۔ بس یہاں آنے تک کی کہانی معلوم ہے۔'

کمرے میں دھند چھا گئی تھی —

یہ دھند یکا یک ہماری آنکھوں کے آگے آگئی تھی۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

باہر سے بھجن کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

رمتا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

'وہ گھر سے بھاگ گیا تھا — کیوں —؟ یہ نہیں بتایا۔ دلّی سے میرٹھ آ گیا۔ یہاں کا لکا بابا ٹکرائے۔ جو پیدل ہی میرٹھ سے ہری دوار جا رہے تھے۔ سڑک کنارے وہ بیہوش پڑے تھے۔ لیکن ان کی خبر لینے والا کوئی نہیں تھا۔

پھر —؟' یہ تھاپڑ تھا۔

'علوی نے کالکا بابا کو کچھ لوگوں کی مدد سے اسپتال پہنچایا — انہیں ہوش

'مسلمان ہونے کے باوجود؟'

'ہاں کٹر کالکا بابو اچانک وچار دھارا کی سطح پر موم ہوگئے — علوی نماز پڑھتا تھا — اور وہ پوجا کرتے تھے۔ پھر بابا کالکا نے شملہ جانے کا ارادہ کیا۔'

'شملہ۔؟' تھاپڑ چونکا۔

'ہاں۔ شملہ کی پہاڑیوں پر کالکا بابا کے گرو بھیرو ناتھ تھے — یہاں سے دونوں شملہ آگئے۔ کالکا بابا نے بھیرو ناتھ سے علوی کو ملایا۔ بھیرو ناتھ نے کہا۔ یہ لڑکا جس مارگ پر ہے اسے نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ میں — اسے سنسار میں رہنے دے۔ اپنے ساتھ لے کر نہ گھوم۔ یہاں سے کالکا بابا اور علوی کے راستے جدا ہوگئے — پھر علوی نے کچھ دن وہاں کام بھی کیا۔ شاید کسی دکان میں۔'

'ہاں۔'

'پھر......؟' رمتا گہری سوچ میں تھا — 'یہاں اسے وہ سادھو ٹکرائے جو ہمالیہ کی پہاڑیوں میں تپ کیا کرتے تھے — علوی نے ان کی بھی سیوا کی۔'

'کیا وہ بھی علوی کے بارے میں جانتے تھے؟'

'ہاں — ان سادھوؤں کے ساتھ علوی یہاں اجودھیا آیا تھا — یہ سادھو پاس کے آشرم میں ہی ٹھہرے تھے۔ ترلوکی بابا کے آشرم میں۔ اور اتفاق کہ اسی دن ترلوکی بابا سیڑھیوں سے پھسل کر گر پڑے — اور علوی نے ایک بار پھر اپنی سیوا سے ان کا دل جیت لیا۔ سادھوؤں نے ترلوکی بابا کو بتایا۔ کہ بڑا عجیب لڑکا ہے۔ مسلمان ہے۔ مگر دلوں کو جیتنا جانتا ہے۔ اور ترلوکی بابا نے کہا — کہ اصل مذہب تو انسان کا کرم ہے۔ باقی دھرم تو ہم نے بنائے ہیں۔ پھر علوی ترلوکی بابا کے ساتھ رہنے لگا۔'

'اب کہاں ہے۔؟' مجھ سے کہیں زیادہ تھاپڑ کے تجسس میں اضافہ ہوچکا

تھا —

'ترلوکی بابا کے پاس سادھوؤں کا ایک جتھا ہری دوار سے آیا ہوا تھا۔'

'پھر —؟'

'ترلوکی بابا کہتے تھے۔ رمتا جوگی ہے علوی — شاید ہری دوار نکل گیا ہو۔'

ترلوکی بابا کہاں رہتے ہیں۔ ہمیں لے چلو گے؟'

'کیوں نہیں۔ ابھی چلیے۔'

یہاں سے ہم ترلوکی بابا کے آشرم گئے — یہ وقت ان کے آرام کا وقت تھا — لیکن جب انہوں نے علوی کے بارے میں سنا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔

'بھگوان کی لیلا۔ اتنا ادھ بھت بچہ میں نے جیون میں کہیں نہیں دیکھا۔'

ترلوکی بابا ۶۰ کی عمر کے ہوں گے۔ چہرہ بڑا اور پرنور — اس وقت وہ دھوتی اور بنیائن میں تھے۔ انہوں نے کم وبیش وہی باتیں بتائیں جو رمتا بتا چکا تھا۔ مگر وہ علوی کی تعریف کر رہے تھے۔

'علوی جیسے بچے ہوں تو دھرم یدھ ہی سماپت ہوجائے — ایک ایشور — سب اس کی اُپاسنا کرنے والے......' انہوں نے انگلیوں سے آسمان کی طرف اشارہ کیا —

ہمارا کام پورا ہوچکا تھا۔ جو معلومات حاصل کرنی تھی، ہم حاصل کرچکے تھے — اب ہم خانقاہ واپس لوٹ رہے تھے۔

واپس لوٹتے ہوئے ہم دونوں خاموش تھے —

ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے —

بنگلہ ہاؤس سے شروع ہونے والی کہانی اس انجام تک پہنچی ہے۔ سوچنا بھی مشکل تھا—

'لیکن اسامہ کیا چاہتا ہے—؟

وہ کیوں ایسا کر رہا ہے—؟

ہزاروں سوالات تھے۔ لیکن ہر جواب کی کڑی اسامہ کے پاس ہی تھی—ہم صرف اپنی تسلیاں کر سکتے تھے۔ ہاں، وہ زندہ ہے۔ یہ بات مجھے حوصلہ دینے کے لیے کافی تھی۔ مگر وہ ہے کہاں—واپس کیوں نہیں آتا—کیا ہری دوار میں ہے—یا پھر ہری دوار سے بھی کہیں آگے نکل گیا ہے؟

تھاپڑ سنجیدہ تھا—

'کبھی کبھی زندگی امتحان لیتی ہے۔ صرف سوال کرتی ہے—اور جواب ہمارے پاس نہیں ہوتے۔'

جواب صرف اسامہ کے پاس تھا۔

(۲)

ہم خانقاہ واپس آچکے تھے۔ سناٹے میں ڈوبی ہوئی رات—ہم کمرے سے باہر برآمدے میں آگئے—باہر کتے بھونک رہے تھے۔ دور آسمان پر چھائیوں کا ہجوم تھا—جیسے اندھیرے میں بہت سے بادل اکٹھے ہوگئے ہوں۔

' وہ کیا کرنا چاہتا ہے—' میں چیخا تھا—'آخر اسامہ کیا چاہتا ہے۔'

[illegible] میری پریشانی یہ تھی کہ وہ شملہ کیوں گیا؟

ہاں—

اس کا بھی جواب مل گیا۔ میرٹھ۔ میرٹھ سے شملہ۔ میرٹھ میں بھی وہ اپنے لوگوں سے نہیں ملا۔'

' اپنے لوگوں؟'

' اپنے ہم مذہب'

' ہاں۔' میری آواز ڈوبتی ہوئی تھی—

'وہاں اس نے سڑک پر بیہوش پڑے ایک سادھو کی مدد کی۔ وہاں سے شملہ گیا۔ جس سے ملا۔ ان کے نظریے بدلتے گئے۔ مجھے سوچنے دو ارشد پاشا۔'

تھاپڑ نے جیب سے سگریٹ نکال لی تھی۔ دھویں کے چھلے بناتا ہوا وہ غور وفکر میں ڈوب گیا تھا—

' وہ ایسے لوگوں سے ملا جو کٹر تھے۔ اور جیسا انظار صاحب نے کہا۔ وہ اپنی شناخت کے ساتھ ملا۔ شناخت چھپا کر نہیں۔'

' مطلب؟'

' میرٹھ۔ شملہ۔ اجودھیا۔ اور اب ہری دوار۔ وہ کٹر سادھوؤں سے ملا۔ وہ بھی ایسے پرآشوب موسم میں۔ جہاں مسلمان نام ادھرم، اوشواس اور آتنک واد کی علامت ہے۔ تم سن رہے ہو ارشد پاشا—اور یقینی طور پر وہ جن لوگوں سے ملا، وہ مسلمانوں کے بارے میں اچھی رائے یا نظریے نہیں رکھتے ہوں گے۔'

' ممکن ہے رکھتے ہوں—'

' نہیں۔ میں ایسے لوگوں کو قریب سے جانتا ہوں '

تھاپڑ نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا—'جو تم سوچ رہے ہو، ایسا نہیں ہے۔

قیاس لگا سکتے ہیں۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ اس سے ایسے لوگ [illegible]
سادھوسنت سے وابستہ تھے — لیکن وہ ان لوگوں سے خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ نماز بھی پڑھتا تھا —'

میں پھر زور سے چیخا — 'یہی تو سمجھنا ہے مجھے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیا ہے اس کے دل میں —؟'

تھاپڑ نے گہری سانس لی — 'اب اس کہانی کو ذرا شروع سے دیکھو ارشد پاشا — چار معصوم بچے عشا کی نماز کے بعد گھر سے نکلتے ہیں۔ پولس والوں سے ان کی کہاسنی ہوتی ہے۔ بٹلہ ہاؤس کا انکاؤنٹر سامنے آتا ہے۔ پولس اسامہ کے دو دوستوں کو مار گراتی ہے — اور ایک دوست پولس کی حراست میں ہوتا ہے۔'

'ہاں'۔ میں غور سے تھاپڑ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''میں اسامہ کے فیصلے کو ان کڑیوں سے ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک بار تین سال پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اردو ڈپارٹمنٹ میں گیا تھا۔ غالب پر سے می نار تھا۔ میں نے اردو ڈپارٹمنٹ کے ان بچوں کو غور سے دیکھا — لڑکیاں سروں پر آنچل رکھے — معصوم سے لڑکے — وہاں کی مکمل تہذیبی فضا ایسی تھی، جس نے مجھ پر جادو کر دیا — طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں — اتنے معصوم — فرشتہ صفت — یہ وہ بچے تھے ہی نہیں جن کی وجہ سے آج کے اسٹوڈینٹس بدنام ہیں — ہنگامہ۔ مار پیٹ۔ لڑائیاں۔ تین سال گزر گئے۔ لیکن جامعہ کے اردو ڈپارٹمنٹ کے ان بچوں کا چہرہ نہیں بھول سکا — 'تھاپڑ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا — اسامہ نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ ایک تہذیب یافتہ ماحول میں۔ لیکن اس نے کیا دیکھا —؟ اس نے فرق کے کیڑے دیکھے۔ ہندو اور مسلمانوں کا فرق — دہشت کی کارروائیوں کو دیکھتے

آ جاتے ہیں۔

'ہاں'

تھاپڑ نے سگریٹ بجھادی — 'اسامہ تیزی سے ایک نئے افق یا نئے نظریے کی طرف بڑھ رہا ہے — اور وہ بھی اپنی مسلم شناخت کے ساتھ — وہ ایسے لوگوں سے مل رہا ہے جو کٹر ہیں۔ وہ ان سے اپنے نظریے بانٹتا ہے — اور ان کا دل جیت لیتا ہے۔'

تاریکی کے سائے گھنے ہو گئے تھے —

'ممکن ہے۔ ایسا ہی ہو۔ لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔'

'کل صبح ہم ہری دوار کے لیے نکل جائیں گے۔' تھاپڑ نے میرے ہاتھوں کو تھاما۔

'پریشان مت ہو۔ کیا یہ کم ہے کہ ہر جگہ ہمیں اس کی موجودگی کے سراغ ملتے جا رہے ہیں۔'

میری آنکھوں میں اسامہ کا چہرہ ناچ رہا تھا۔ ہونٹ خاموش تھے۔

کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اب بند ہو چکی تھیں۔

اب ہمارا اگلا پڑاؤ ہری دوار تھا۔

••

تلاش

کسی کو تلاش کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ وہ بھی جب آپ کے پاس نہ پتہ ہو نہ

ہورہے تھے، وہ دلچسپ تھے۔ دنیا ایک نئی شکل میں ہمارے سامنے آ رہی تھی جیسے بھلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے بعد جو دنیا ہمیں بے حد ڈراؤنی اور دہشت زدہ معلوم ہورہی تھی، وہ دنیا حقیقت میں ایسی نہیں تھی — یہاں سیدھے سادھے مہذب لوگ بھی تھے۔ اور شاید اسی وجہ سے اس حسین دنیا کا تصور بھی زندہ ہے۔

ہری دوار پہنچنے تک ہم خاصا تھک چکے تھے۔

اس لیے یہ طے کیا گیا کہ آج ہوٹل میں آرام کریں گے۔ اور دوسرے دن صبح سے ہی اسامہ کی تلاش شروع کردی جائے گی۔ یہ مناسب فیصلہ تھا۔

تھاپڑ کی الجھن یہ تھی کہ اسامہ بار بار اپنا نام کیوں تبدیل کررہا ہے۔

'شملہ میں وہ بدر تھا۔ یہاں علوی'

'ہاں۔ لیکن نام بھی جان پہچان والوں کے۔ ایسا کیوں ہے؟'

'ممکن ہے اس کو اس بات کا خیال ہو کہ ہم اسے یہاں تلاش کرنے بھی آسکتے ہیں۔'

'ممکن ہے۔'

'اس طرح وہ ہماری پریشانیوں کو کسی حد تک کم کررہا ہے — کہ وہ زندہ ہے اور ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'

میں گہری سوچ میں گرفتار تھا — 'لیکن اگر وہ ہمارے لیے اتنا ہی پریشان ہے تو پھر ملتا کیوں نہیں۔'

'ممکن ہے جانے انجانے اس کے پاس ایک بڑا مقصد آ گیا ہو — اور وہ اسی مقصد کی تلاش میں بھٹک رہا ہو — ابھی جیسے ہم اس کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔'

ہری دوار۔ گنگا کی نگری۔ مایا پوری۔ ایک ملک میں رہتے ہوئے یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو جاننا مجھے اچھا لگتا ہے — میں یہاں پہلے بھی آچکا تھا۔

دوسرے دن صبح میں ناشتہ کے بعد ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ صبح نکھری نکھری سی تھی — ہوا شائیں شائیں چل رہی تھی۔

چلتے ہوئے تھاپڑ ہمیں اس شہر کے بارے میں بتا رہے تھے — اس شہر کا قدیم نام مایا تھا — مایاپوری — مایا پوری کو دھرتی کا نابھی استھل کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانی جسم میں ناف کو جو حیثیت حاصل ہے وہی دنیا کے نقشہ میں ہری دوار کو — راجہ دکش کے یگیہ توڑنے کے بعد شیو بھگوان کو غصہ آ گیا اور اپنی اہلیہ ستی کے جسم کو کندھے پر اٹھا کر تانڈو کرنے لگے۔ کہتے ہیں اسی تانڈو میں ستی کی نابھی ٹوٹ کر ہری دوار میں گری تھی — کہتے ہیں راجہ بھگیرتھ جب گنگا کو لے کر آئے تو گنگا اس برہم کنڈ سے ہوتی ہوئی بہی — یہ بھگوان بدری ناتھ دھام جانے کا دروازہ ہے۔ اسی لیے اس جگہ کو ہری دوار کہا گیا۔'

تھاپڑ مسکرایا — 'کسی کسی شہر سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہوجاتی ہیں — یہیں ہری دوار کے نیل پروت پر بیٹھ کر شیو نے منتھن میں نکلا ہوا ہلاہل، پیا تھا۔ زہر یعنی وش کو کنٹھ یعنی گلے میں روک کر شیو، نیل کنٹھ بن گئے۔ اور یہاں کی شوالک پروت مالا نیل پروت بن گئی — کہتے ہیں وش کا تاپ مٹانے کے لیے شیو نے گنگا کی جس لہر میں غوطے لگائے، وہ لہر اب بھی نیل لہر بن کر بہہ رہی ہے۔

سمندر منتھن —

میں اس لفظ پر آ کر ٹھہر گیا ہوں — ایک وش ہے، جسے میں نے پی رکھا

بھی چھوڑ دیا۔

راکشس اور دیوتاؤں کا یدھ۔

سمندر منتھن ——

شیو کا تانڈو ——

ایک تانڈو اس وقت میرے جسم میں بھی چل رہا ہے۔ مگر لب سلے ہوئے ہیں —— جسم بے حرکت ——

اپنے ہی جسم کا ایک حصہ گم ہے ——

اور بس۔ اس کی تلاش رہ گئی ہے ——

ہم دیر تک ہری دوار کے چکر لگاتے رہے۔ وہاں کے مین بازار، موتی بازار بھی گئے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھایا۔ برہمکنڈ، ہڑ کی پوری...... گنگا کی دودھیا دھار —— عقیدتمندوں کی اپنی دنیا ئیں ہوتی ہیں۔

اب صبح سے شام ہوگئی تھی۔ ہم کتنے ہی لوگوں سے ملے۔ دکانوں میں پوچھا۔ سادھوؤں سے بات کی۔ شام گہری ہوگئی تھی۔ ایک سادھو نے ٹھہر کر بتایا۔ آگے سادھو آشرم ہیں۔ وہاں بہت سے سادھو ملیں گے۔ ناگا سادھو بھی ہیں۔ سنیاسی روڈ کہلاتی ہے وہ جگہ —— کنکھل کے نام سے بھی لوگ بتا دیں گے۔ وہاں دلکش مندر بھی ہے۔ اکھاڑے بھی ملیں گے —— جیسے پنچایتی اکھاڑہ، نرل اکھاڑہ —— اتنی معلومات ہمارے لیے کافی تھی۔ لیکن کنکھل کا پروگرام ہم نے دوسرے دن صبح پر ٹال دیا تھا —— تھاپڑ نے کہا تھا، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب سادھو مدرانی کر بھگوان شیو کی طرح تانڈو کرنے لگتے ہیں۔

دوسرے دن صبح سنیاسی روڈ یا کنکھل کی تلاش میں ہمیں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ وہاں ایک قطار سے کئی آشرم یا اکھاڑے بنے ہوئے تھے۔ گیروا کپڑوں میں بے نیازی سے آتے جاتے سادھوؤں کو ہم سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ ہوا تیز تھی —— دھول اڑ رہی تھی —— اکھاڑوں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ عام طور پر گنگا میں ڈبکیاں لگا کر ہی یہ سادھو اپنی صبح کی شروعات کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان اکھاڑوں میں غیر ملکوں سے آنے والے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہ اتفاق ہو یا کرشمہ کہ ہم نے جس سادھو کو پہلی بار اسامہ کی تصویر دکھائی وہ اسے پہچاننے والا نکلا۔

'علوی......' سادھو نے مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔ 'وہ بانس کا پھاٹک دیکھ رہے ہیں ——؟'

'ہاں'

'سیدھے وہاں چلے جائیے۔ وہ آچاریہ منی کا آشرم ہے۔ سب انہیں آچاریہ جی کہتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ گھاٹ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔'

ہم تیزی سے آچاریہ منی کے آشرم میں داخل ہو گئے۔ یہ باقی آشرم یا اکھاڑے سے مختلف تھا۔ یہاں سادگی بہت تھی۔ باہر دو تین چار پائیاں نکلی ہوئی تھیں۔ چھت کی جگہ لکڑیوں کے بڑے بڑے لٹھے تھے جن پر کھپڑوں سے چھاونی کی گئی تھی۔ اس کے ٹھیک نیچے تین دروازے بنے تھے۔ ایک دروازے کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا —— آچاریہ ابھی پوجا پاٹھ سے فارغ ہوئے ہیں۔ آپ مل سکتے ہیں۔ اندر داخل ہونے کے بعد تھاپڑ اور میں نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

تھی۔ اور تخت لگا تھا۔ لکڑی کا تخت — جس کے دونوں طرف مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ آچاریہ اسی تخت پر بیٹھے تھے۔ کمرے میں پوجا کی اگربتیاں جل رہی تھیں۔

وقت ضائع کیے بغیر تھاپڑ نے علوی کی تصویر آگے بڑھا دی —

مسکراتے ہوئے آچاریہ بولے۔

' علوی۔ اوہ...... اپنا بچہ ہے۔ رمتا جوگی — ایک مہان آتما بستی ہے اس میں۔'

مجھے حیرت ہوئی۔ آچاریہ نے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں موند لیں — پھر کہا۔

' تو آپ دلّی سے آئے ہیں۔ اس کے پتا —؟'

' جی ہاں۔'

اور یہ آپ کے دوست؟ '

' ہاں۔ اجے سنگھ تھاپڑ۔'

' آچاریہ مسکرائے — مجھے پتہ تھا۔ ایک دن آپ لوگ اس کی تلاش میں آئیں گے۔ مگر کہاں تلاش کریں گے اسے —؟'

' مطلب؟ ' میری دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔

' رمتا جوگی ہے — میں نے بتایا نا۔ عام بچہ نہیں ہے۔ بھگوان نے کسی بڑے کاریہ کے لئے بھیجا ہے اسے۔ ایک مسلمان بچہ اس طرح ہم سادھو سنیاسیوں کا هردے جیت لے۔ آسمھو۔ وہ بھی اپنے دھرم کا پالن کرتے ہوئے۔'

آچاریہ ہنسے۔ ورشوں بعد اس کی اپیکشھی نے آبھاس دلایا۔ کہاں کا دھرم۔ سارے دھرم تو ایک ہیں — سرو دھرم کی شاکھائیں جہاں ملتی ہیں۔ وہ اومکار ہے۔

وہ آپ — کے ساتھ اجودھیا سے یہاں آیا۔ مطلب ہری دوار؟ '

تھاپڑ نے بے چینی کی کیفیت میں پوچھا —

'ہاں۔

'پھر کہاں گیا وہ —؟'

آچاریہ مسکرائے — 'تھوڑا دھیریہ رکھیے۔ کہاں گیا، اس سے زیادہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کیوں گیا — ہم سادھو کہلاتے ہیں۔ جیون بھر بھگوان کو جاننے میں اس کی تپسیا میں لین رہتے ہیں۔ لیکن کیا ملتا ہے۔ کیا ملتا ہے بھگوان؟ کبھی کبھی سب پاکھنڈ لگتا ہے — دھرم تو دلوں کو جوڑتا ہے — لیکن دیش میں جو ہو رہا ہے — وہ ہندو مسلم — دھرموں کے بٹوارے — وہ ہندو یہ مسلم۔ ایک سے تھا جب ہم بھی اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ اور شاید اس سے باہر بھی نہیں نکلتے۔ '

آچاریہ نے کسی کو آواز دی — پاٹھک جی۔'

دھوتی سنبھالتے ہوئے کندھے پر گیروا شال لپیٹے پاٹھک جی آ گئے۔

' ذرا بتایے انہیں۔ جب ہم ترلوکی بابا کے آشرم میں گئے تھے — کیا دیکھا —؟'

پاٹھک جی مسکرائے۔' عجیب نظارہ تھا۔ ترلوکی بابا پوجا میں لین تھے۔ اور وہیں کچھ فاصلے پر وہ بالک نماز پڑھ رہا تھا — ہم چھ سات لوگ تھے — سب کے لیے یہ کرشمہ تھا۔ کیونکہ ہم ترلوکی بابا کو بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ ادھر بابا نے پوجا ختم کی۔ اور ادھر اس نے نماز — دو بجے کا سمے رہا ہوگا۔ آچاریہ نے ہنس کر پوچھا تھا۔ بابا، یہ کیا چل رہا ہے۔ تب تک بالک نماز پڑھ چکا تھا۔

' پھر؟ '

ان کے پیچھے نہ کوئی بابا [illegible] — بالک پورے [illegible]
ہمارے پاؤں دھلانے کے لیے پانی لے آیا۔ ہمیں [illegible] ایک
ساتھی کو صبح سے بخار چڑھ رہا تھا۔ بالک نے یہ کیفیت بھانپ لی۔ اسی نے اس نے
ساتھی کے لیے دوا کا انتظام بھی کر دیا — پھر میں نے دیکھا۔ اکھاڑے میں آنے والوں
کے ساتھ وہ جو ادب دکھا رہا ہے' اچھے اچھے سنتوں میں یہ بھاؤ نہیں ہوگا۔'

'جائیے پاٹھک جی۔'

پاٹھک جی کو بھیج کر آچاریہ گمبھیر آواز میں بولے — 'ترلوکی نے کہا، مجھے پتہ
ہے — وہ میرے دھرم کا نہیں — دھرم تو انسانوں کا ہوتا ہے نا آچاریہ جی۔ اور اس
بالک کا سوابھاؤ — ترلوکی نے کہا۔ یہ بالک سویم نہیں آیا۔ یہ دیودوت ہے۔ یہ بھیجا گیا
ہے ہمارے مارگ درشن کے لئے۔'

آچاریہ نے ٹھنڈی سانس لی — 'ہم نے علوی کی کہانی جان رکھی تھی۔ ترلوکی
بابا نے سب بتایا تھا۔ وہاں سے وہ میرے ساتھ ہولیا۔ اور یہاں جتنے بھی اکھاڑے
ہیں اس نے سب کا دل جیت لیا۔ جب سب کا مالک ایک تو انتر کرنے والے ہم کون
ہوتے ہیں۔'

'لیکن آپ کو کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہے —؟'

تھاپڑ نے پوچھا —

'آہ۔ مجبور نہیں۔ وہ مجبور نہیں ہے — یہ سے ہے۔ ہم نیتی کہتے ہیں اسے۔
اور اسی لیے ہم نے اسے رمتا جوگی کہا ہے۔ وہ ایک جگہ نہیں ٹھہرے گا۔ میں نے
سوچا تھا۔ بہت سوچا — کہ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے — وہ اپنے دھرم کے لوگوں کے
درمیان کیوں نہیں۔'

'ہاں — یہی بات۔'

آچاریہ [illegible] ہمارے دھرم سے کوئی علوی اٹھے اور وہ پہنچے تمہارے لوگوں
کے بیچ — علوی اپنے لوگوں کو کیا سمجھاتا — لیکن کہیں کوئی ایک بات اس کے دماغ
میں پھنس گئی تھی۔'

وہ کہتے کہتے ٹھہرے —

میں بغور ان کی باتیں سن رہا تھا —

تھاپڑ نے میری طرف دیکھا۔ آچاریہ سنجیدہ تھے —

'میں آپ سے پوچھونگا نہیں کہ علوی کے ساتھ کیا ہوا — وہ گھر سے کیوں
بھاگا۔ اور بھاگنے کے بعد اپنے دھرم پر قائم رہتے ہوئے وہ ہمارے لوگوں سے کیوں
ملا — بھاگیہ — نہیں کیول بھاگیہ نہیں۔ رہسیہ — بھگوان کا رہسیہ ہے۔ شاید وہ
سدھ کرنا چاہتا تھا کہ......'

آچاریہ مسکرائے — 'جب کہ اسے سدھ کرنے کی اوشکتا نہیں تھی۔ جو
سدا سے اندھکار میں ہیں، ہم ان کی آنکھیں نہیں کھول سکتے — بھگوان بھی نہیں کھول
سکتا — لیکن جیسا کہ ترلوکی بابا نے کہا — وہ دیودوت بن کر ہمارے بیچ آیا — ہم میں
ایک نئی الکھ جگانے۔'

'تو کیا اب وہ یہاں نہیں ہے —؟'

'ہاں'

'پھر کہاں گیا ہوگا —؟'

'یہ تو وہی بتائے گا......'

'آپ نے پوچھا نہیں —؟'

'رمتا جوگیوں کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے — آج یہاں، کل وہاں —،

'پھر بھی'

کوئی نہیں جانتا — لیکن آپ اداس مت ہوئیے — کیونکہ وہ عام بچہ نہیں ہے۔'

'لیکن مجھے بیحد عام بچہ چاہیے — خاص نہیں۔' میری آواز کمزور تھی۔

آچاریہ نے غور سے میری طرف دیکھا — بھگوان بدھ نے مرت انسان کو دیکھا اور دنیا کا موہ چھوڑ کر نکل پڑے — ایسی ہزاروں کہانیاں ہر دھرم میں مل جائیں گی۔ میرا وشواس ہے — بھگوان آپ کے بیٹے سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔ آپ پتا ہیں۔ آپ کی چنتا واجب ہے۔'

'پھر بھی جاتے ہوئے کچھ تو بولا ہوگا — یاد کیجئے آچاریہ جی — ' تھاپڑ کی آواز میں تجسس تھا۔

آچاریہ جی نے پھر آواز دے کر پاٹھک کو بلایا۔ پاٹھک جی دندناتے ہوئے آگئے۔

'آدیش......؟'

'آپ کو یاد ہے، جس دن وہ بالک گیا تھا۔......'

'ہاں آچاریہ جی۔ سبھا سے کچھ لوگ آئے تھے۔ رات میں وشرام کیا تھا یہاں۔'

'کتنے لوگ تھے۔'

'کل سات لوگ۔'

'کیا یہ کسی کو پتہ ہے کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے — ؟'

'نہیں آچاریہ جی۔'

'ذرا کسی سے پوچھ کر دیکھئے۔'

'کوئی لابھ نہیں۔ اکثر سبھا سے لوگ آتے ہیں۔ رکتے ہیں اور چلے جاتے

ہیں — آپ ہی کا آدیش ہے کہ سادھوؤں کو زیادہ تنگ نہ کیا جائے۔'

جائیے پاٹھک جی۔

پاٹھک جی کے جانے کے بعد آچاریہ جی دل ہی دل میں کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔

'وہ لوگ ہندو مہا سبھا سے آئے تھے۔ یا سنگھ سے۔ علوی ان لوگوں کے ساتھ جانا چاہتا تھا — ' وہ ہنسے — ' چلا گیا ہوگا۔ بہتے پانی اور جوگی کو کون روک سکا ہے۔ لیکن اس کی کوئی سوچنا جب بھی ہمیں ملے گی تو ہم آپ کو ضرور بتائیں گے۔'

'کیا — ' اس بار میں نے چونک کر تھاپڑ کی طرف دیکھا۔

تھاپڑ نے آچاریہ کی طرف۔

آچاریہ سنجیدہ تھے — 'سنسار ایک بھید ہے۔ رہسیہ ہے۔ یہ بالک بھی ایک رہسیہ ہے۔ وہ من کی شانتی چاہتا ہے۔ اور اس شانتی کے پیچھے وہ بھٹک رہا ہے۔ کبھی اس دوار۔ کبھی اس دوار۔ لیکن وہ غلط نہیں ہے۔ وہ کچھ برا نہیں کر رہا۔ بلکہ وہ کچھ اچھا ہی کر رہا ہے۔ تو اسے کرنے دیجئے۔'

••

اب ہم بڑے بازار سے گزر رہے تھے۔ یہ ہری دوار کے بھیڑ والا علاقہ تھا۔ مجھے بار بار غصہ آ رہا تھا۔

'وہ دنیا بدلنے چلا ہے۔ اور وہ اب ہندو مہا سبھا یا آر ایس ایس کے لوگوں کے ساتھ ہے۔ مگر کہاں — نہیں معلوم۔'

'یہ تم سوچ رہے ہو کہ وہ دنیا بدلنے چلا ہے۔'

'پھر کیا سوچوں؟ ان ساری باتوں کا مطلب کیا نکلتا ہے۔'

تھاپڑ گہری سوچ میں تھا —

مطلب وہی ہے جو ایک عرصے میں ہمارے [illegible]
ثابت کرنا چاہتا ہے — یہ کہ ہر مسلمان برا نہیں ہے —'

'ہاں —' اس بار میں نے غصہ کا مظاہرہ کیا — 'مگر کیا اس کے لیے وہ سب کرنا ضروری ہے جو اسامہ کر رہا ہے۔ وہ بھی الگ الگ نام کے ساتھ۔'

'مگر ایک شناخت کے ساتھ۔'

'یہ تم پہلے بھی بتا چکے ہو۔ مگر اس سے فائدہ کیا — وہ اس سے ہندستان کی تقدیر بدل دے گا۔'

'میں یہ نہیں جانتا کہ وہ ہندستان کی تقدیر بدلے گا یا نہیں۔ لیکن اس نے اپنی طرف سے ایک چھوٹی سی کارروائی شروع کی ہے۔'

'لیکن جیسا آچاریہ نے بتایا، اب وہ سنگھ کے لوگوں کے ساتھ ہے — اور سنگھ کے لوگوں کے ساتھ ہونے کا مطلب جانتے ہو؟'

تھاپڑ سنجیدہ تھا — 'وہ اپنا راستہ بنا رہا ہے — تم سے اور دوسروں سے الگ کا راستہ۔ اسے بنانے دو۔'

'کیا وہ واپس آئے گا؟'

اس بار میری آواز میں تھرتھراہٹ شامل تھی —

'ضرور آئے گا' —

●●

اب دلّی واپس لوٹنا تھا۔

قدم بوجھل تھے۔ اور کہیں نہ کہیں ایک شکست کا احساس بھی شامل — مجھے رباب کی یاد آرہی تھی۔ رباب کو کیا جواب دوں گا۔

تب تک فیصلہ نہیں آیا تھا —

لیکن فیصلہ آنے میں چند ہی دن رہ گئے تھے۔

(۳)

بٹلہ ہاؤس علاقے میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ لوگ بھولنے لگے تھے کہ کبھی اس علاقے میں انکاؤنٹر کی بے رحم اور سنسنی خیز واردات بھی ہوئی تھی۔ میں ارشد پاشا...... اجودھیا اور ہری دوار سے ناکام و نامراد واپس تو لوٹ آیا تھا لیکن جیسے جیسے فیصلے کی گھڑی قریب آرہی تھی، میری دھڑکنیں بڑھتی جارہی تھیں۔ علوی، اسامہ کے اسقدر قریب تھا کہ وہ اجودھیا اور ہری دوار میں اسی نام سے جانا گیا — اور اتنے سارے ناموں میں اس نام کو اپنانے کا مطلب صاف تھا — اسامہ کے لیے اس نام میں کتنی کشش، کتنی مضبوطی تھی۔

رباب ڈری ہوئی تھی —

'کیا تم سچ مچ علوی کے خلاف......؟'

آنکھوں میں دہشت کا چہرہ ابھرتا ہے۔ میں زور سے چیختا ہوں اور کوئی راستہ ہے۔ بتا سکتی ہو؟ کوئی راستہ؟'

'ہونہہ'

رباب خاموش ہے — 'فیصلہ کیا ہوگا؟'

'یہ میں بھی نہیں جانتا'

'فیصلے کو کیا ہونا چاہئے —؟'

یہ بھی میں نہیں جانتا۔ مگر......

'مگر کیا......'

میں نے آنکھیں جھکا لیں — ان کے حق میں......'

'یعنی اپنے حق میں نہیں؟' رباب کا چہرہ پتھر ہو رہا تھا — ہاں میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہو تو بہتر ہے۔

رباب نے گہری سانس لی۔

دہشت کی دھمکیوں نے گھر میں خوف کے انجکشن لگا دیے تھے۔ میں نے یہ باتیں جان بوجھ کر تھاپڑ کو نہیں بتائی تھیں۔ اور بتانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے اچانک ریڑھ کی ہڈی میں داخل ہوتی ہوئی سرد لہروں کو محسوس کر لیتا۔ ڈراؤنے خواب مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے۔ ہوش میں آنے تک جسم کانپ رہا ہوتا۔

کیا سارے فیصلے ڈر ڈر کے لینے ہوں گے — ؟ کیا ساری زندگی اسی ڈر کی آغوش میں بسر کرنی ہوگی — ؟ یہ سوالات مجھے زخمی کرتے رہتے۔ مضبوط ہوتے ہوتے دہشت کی دھمکیوں کی زد میں آ جاتا۔ اور پھر اندر کی کمزوری پیر تسمہ پا کی طرح مجھے اپنے قابو میں کر لیتی —

مگر اس کے باوجود مجھے فیصلے کا انتظار تھا۔

وہ فیصلہ جو مجھے خوفزدہ کر رہا تھا — جس سے میرے گھر کا سکون، امن چین، یا بربادی اب وابستہ ہو گئی تھی — لیکن اس دھمکی کے باوجود میں یہ فیصلہ اپنے حق میں چاہتا تھا۔

●●

میں ارشد پاشا —

ہندستان کی پچیس کروڑ اقلیت میں سے ایک۔ ایک ڈرا سہا مسلمان۔ اور

مجھے یہ تسلیم کرتے ہوئے ذرا بھی ہچک یا گھبراہٹ نہیں ہے کہ بیحد سیکولر ہونے کے باوجود میں آنے والے فیصلے کو اپنے نام دیکھنا چاہتا تھا —

لیکن کیوں — ؟

جہاں میری زندگی خود داؤ پر لگی تھی —

جیسے میری اپنی چیخ میرے گلے میں پھنس گئی تھی —

شام میں تھاپڑ آیا۔

وہ ایک ٹک میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا —

''تمہیں کیا لگتا ہے۔ اس بار ڈرامے کے رنگ بدل جائیں گے — ڈرامہ ہر بار ایک ہی ہوتا ہے — لیکن ہم لوگ کٹھپتلیوں کی طرح ان ڈراموں کا ایک حصہ بنے رہتے ہیں۔ حکومت تمہیں خوش کرنے کے لیے کچھ کمیٹیاں بنا دیتی ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد کتنا عمل ہوا — رنگ ناتھ مشرا کمیشن میں کیا ہوا؟ اور تمہاری لبراہن کمیشن — ؟'

تھاپڑ ہنسا —

'جو حادثے کے سب سے بڑے مجرم ہوتے ہیں — یہ قانون اور انصاف ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے۔ اٹھارہ سال پہلے کی ساری کہانی ابھی بھی لوگوں کے سامنے ہے۔ رپورٹس ہیں — بیانات ہیں اور سب سے بڑھ کر سی ڈی اور تصویریں ہیں — لیکن لبراہن کمیشن نے سارے بڑے ملزموں کو انصاف دلا دیا — اور جھٹ بھیجے کار سیوکوں کو مجرم قرار دیا۔ وہ کار سیوک جو چند سکوں یا پاگلپن کے جنون میں ان بڑے لوگوں کے اکسانے پر مسجد توڑ رہے تھے۔ بس وہی مجرم گردانے گئے اور باقی لوگوں کو کمیشن نے راحت کی سانس لینے پر مجبور کر دیا۔'

اندھیرے میں بھٹک رہے ہو' تو میں کہوں گا کہ اس اندھیرے سے باہر نکل آؤ ارشد پاشا— یہاں کوئی اخلاقیات نہیں ہے۔ نہ کوئی دلیل ہے نہ انصاف ہے۔ ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے، انجام گلستاں کیا ہوگا۔'

میری آنکھیں ابھی دھند میں کھوئی ہوئی تھیں۔ بیک وقت ان میں اسامہ کا بھی چہرہ تھا اور دہشت کا بھی۔ میری آواز بوجھل تھی۔

'کچھ بھی ہو۔ لیکن ہم ایک فیصلہ چاہتے ہیں۔ اپنی حمایت میں ہونے والا ایک فیصلہ — اس فیصلہ کا انتظار ہمیں آزادی کے بعد سے رہا ہے — آزادی سے اب تک کوئی فیصلہ ہماری حمایت میں نہیں آیا — جھوٹے دلاسے دیے گئے۔ تسلیاں بہت ملیں۔ یہاں تک کہ ہم اس ملک کا ایک مضبوط ووٹ بینک بھی بن گئے — وہ ووٹ بینک جو کسی حکومت کو بنا سکتی ہے اور گرا بھی سکتی ہے۔ لیکن میرے دوست تھاپڑ — ہم ایک صحیح فیصلے کو ترس گئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آنے والا فیصلہ کتنا تاریخی ہوگا۔ ہماری حمایت میں ہوگا یا نہیں لیکن ہم خاموش ہیں — لب سی دیے گئے ہیں — ملک کی پچیس کروڑ آبادی۔ سانس روکے اس فیصلے کا انتظار کر رہی ہے۔ جانتے ہو تم کیوں؟'

تھاپڑ خاموش تھا — اس کی آنکھیں بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پھر بولنا شروع کیا — 'جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ آزادی سے لے کر اب تک ہم ایک صحیح فیصلے کو ترس گئے — اپنے حق، اپنی حمایت میں ہونے والے فیصلے کو — ہمیں مضبوط کرنے کی ہر کارروائی کبھی کبھی دوغلی لگتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان مین اسٹریم میں نہیں ہے۔ کیسے رہیں گے مسلمان آپ کی مین اسٹریم میں؟ جہاں ہر بار انہیں خوش کرنے کے لیے حکومت بچوں کی ایک ڈگڈگی تھما دیتی ہے — بہت سے چھوٹے چھوٹے فیصلے...... اور یہاں جامعہ میں جو کچھ ہوا۔

معصوم بچے مار دیئے جاتے ہیں — تیرہ معصوم بچوں کا کیریئر چھین لیا جاتا ہے اور خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے میرا بچہ اسامہ گم ہو جاتا ہے — ہری دوار سے اجودھیا تک بھٹکتا ہوا — ایک انصاف مجھے بھی چاہئے۔ میرے بیٹے کو ملنے والا انصاف — اور شاید اسی لیے میری نظریں اس بڑے انصاف کا راستہ دیکھ رہی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم آنے والے کچھ برسوں میں میرا کیا ہوگا۔ اسامہ واپس آئے گا یا نہیں — ؟ یا خود کو اس ملک کا سیکولر شہری ثابت کرنے کے لیے اپنی شناخت کے ساتھ بھٹکتا پھرے گا۔'

میری آنکھوں میں آنسو تھے — 'شاید تم اس سچ کو اس گہرائی سے نہیں سمجھ پاؤ تھاپڑ کہ مجھے اس فیصلے میں' اپنی چھوٹی سی مضبوطی کی امید کیوں نظر آ رہی ہے۔ لیکن 64 برسوں سے ہم امید لگائے اپنی حمایت میں ہونے والے ایک فیصلے کے منتظر ہیں۔'

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ تھاپڑ چپ تھا۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں — ان اٹھارہ برسوں میں ایک دنیا تبدیل ہو چکی تھی — اس درمیان کتنی حکومتیں گئیں اور کتنی نئی حکومتوں نے مورچہ سنبھالا۔ عالمی افق پر کیسے کیسے حادثے رونما ہوئے — اب نئی حکومت تھی اور اٹھارہ برسوں کا رکا ہوا فیصلہ آنے والا تھا۔ معاملہ سنگین تھا۔ میڈیا، بھائی چارگی اور محبت کو فروغ دے رہے تھے۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ جو بھی فیصلہ آئے گا وہ ہندو مسلم دونوں دل سے قبول کریں گے۔ لیکن پھر بھی سیاست کا ماحول گرم تھا — اور سب کی نگاہیں آنے والے تاریخی فیصلے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد اس بھیانک خاموشی کو توڑتے ہوئے تھاپڑ نے لمبی سانس بھری۔

'شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ایک بڑا فیصلہ کئی چھوٹے چھوٹے زخموں کو بھر دیتا ہے۔ ایک بڑے فیصلے سے کئی چھوٹے فیصلوں کے لیے ایک امید کی کرن جاگ جاتی

میری آنکھوں میں چمک لہرائی—

'اور شاید اسی لیے میں اس فیصلہ کا منتظر ہوں۔ یہ فیصلہ میرے حق میں ہوتا ہے تو یہ مجھے سکون دینے کے لیے کافی ہوگا۔'

تھاپڑ نے کرسی پر کروٹ بدلی۔

'تو سکون مل جائے گا تمہیں؟ کیوں ارشد پاشا—اور تم ابھی بھی سوچ رہے ہو کہ فیصلہ تمہارے حق میں آنے والا ہے؟'

'ہاں'

'اور ایسا سوچنے کی وجہ ہے تمہارے پاس—یہ تمہارا میڈیا—اور اس کی بریکنگ نیوز—جس نے اس بار پھر جھوٹے دلاسوں سے تم مسلمانوں کا پیٹ بھر دیا ہے۔'

'مطلب—؟'

تھاپڑ ہنسا—میڈیا پر مت جاؤ۔ حکومت، میڈیا، فیصلے، یہ سب پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ابھی تمہاری حمایت کی ہوا بہہ رہی ہے— تاکہ تم لوگوں کے جذباتی بیانات بھی آ جائیں۔ کہ جو بھی فیصلہ ہوگا تمہیں منظور— کیونکہ میڈیا نے اپنی خبروں سے کچھ ایسا ہی ماحول پیدا کیا ہے— جیسے اس بار یہ فیصلہ تمہارے حق میں جانے والا ہو۔'

'ہاں'

'اور تمہارے مسلم لیڈران کے بیانات بھی آنے لگے۔ کہ جو بھی فیصلہ آئے گا وہ انہیں منظور ہوگا— یہ ان کی خوش فہمیوں کا نتیجہ ہے— مگر ارشد پاشا— تمہیں کیا معلوم کہ فیصلے کی بھنک انہیں نہیں لگی ہو۔'

'جو کھیلا جا چکا ہے—'

'مطلب—؟'

'پہلے فیصلے کی ایک تاریخ رکھی گئی۔ اب دوسری تاریخ دے دی گئی—'

'کیوں؟'

'نہیں جانتا'

'تاکہ گرمائے ہوئے ماحول کو کچھ تو شانت کیا جا سکے—اور اس لیے مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے کہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ ہے—اور یہ فیصلہ بھی کسی قیمت پر تمہارے حق میں نہیں آنے والا — ممکن ہے تمہارے لیڈران بھی خریدے جا چکے ہوں۔ اور ان سے یہ بیانات بھی حکومت کی شہ پر دلائے جا رہے ہوں۔ ارے اس ملک میں سب ممکن ہے دوست — میں اب بھی کہتا ہوں۔ خوش فہمیوں کی دنیا سے باہر نکل کر اس پورے معاملے کو دیکھو اور سمجھو۔'

'میرا دل نہیں مانتا۔'

'اور میرا دل کہتا ہے۔ تم اس بار بھی یہ جنگ ہار چکے ہو ہمیشہ کی طرح۔ اس بار بھی یہ فیصلہ تمہاری حمایت میں نہیں جائے گا۔ دن ہی کتنے بچے ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں کے آگے یہ ساری سیاسی کارروائی اب صاف دکھائی دے رہی ہے۔ جو تم نہیں دیکھ پا رہے ہو میرے دوست،'

میں نے نڈھال ہو کر کرسی پر سر ٹیک دیا۔

'تم نے ہمت توڑ دی۔'

'نہیں۔ صرف تمہیں تمہاری خوش فہمیوں سے نکال باہر کر رہا ہوں۔'

'اس فیصلے میں کہیں نہ کہیں میرا بیٹا بھی ہے۔'

اور اس لیے تم اس ایک تاریخی فیصلے کے ساتھ ان سارے [illegible] چاہتے ہو۔

'شاید۔ 'میری آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی — مجھے انتظار ہے۔ شاید اس لیے بھی کہ ایک بے انصافی کہیں نہ کہیں میرے بچے اور میری قوم کے ساتھ ہوئی ہے۔'

'تمہارے لیڈر بھی تمہاری قوم کی اس نگی کے ذمہ دار ہیں —'

'میں وہ پرانے صفحے نہیں کھولنا چاہتا تھاپڑ — میں صرف اپنے بیٹے کے لیے ایک انصاف چاہتا ہوں — ایک بڑے انصاف کے پردے میں اس چھوٹے انصاف کا بہانہ بھی تلاش کرلوں گا کہ آنے والی سیاست میرے مسلمان بیٹے کے کیریئر سے کھلواڑ نہیں کرے گی...... وہ ایک دن واپس لوٹے گا — اپنی سچ مچ کی آزادی اور خود داری کے ساتھ۔'

' میں بھی چاہتا ہوں کہ وہ واپس آئے۔ لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم پتھریلی زمین پر کھڑے ہوکر اس سچ کو جانو، جس سچ کو دیکھنے سے تمہاری آنکھیں آج بھی کترا رہی ہیں۔'

تھاپڑ نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا — پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا —

'اب چلتا ہوں دوست۔ مگر میرا ایک مشورہ ہے۔ مان لو تو بہتر۔ زیادہ خوش فہمیاں مت پالو۔ خوش فہمیاں اکثر زندگیاں چھین لیا کرتی ہیں —'

پھر وہ ٹھہرا نہیں۔ ہاتھ ملا کر تیزی سے باہر نکل گیا —

میں گہرے سناٹے میں تھا —

اور شاید ابھی اس لمحہ، اس گہرے سناٹے سے باہر نکلنا میرے لیے مشکل تھا —

قدم شل تھے — میں دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ یادوں کی پرچھائیاں ایک بار پھر آنکھوں کے آگے جمع ہوگئی تھیں۔

ان میں دہشت بھی تھا — 'فیصلہ ہمارے حق میں آتا ہے تو ٹھیک، ورنہ علوی کے خلاف...... سمجھ رہے ہو نا ملاجی۔'

تھاپڑ کا سنجیدہ چہرہ سامنے ہوتا — 'تم یہ جنگ ہار چکے ہو۔ یہ فیصلہ تمہارے حق میں کبھی نہیں جائے گا۔'

معزز قارئین'

اور انہی دنوں میں بھیانک خوابوں کی زد میں تھا — رات ہوتے ہی اچانک کسی لمحہ میری نیند کھل جاتی۔ اور کمرے میں ہلتی ڈولتی پرچھائیوں کا رقص مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہوتا — نیند میں آسیبی چہرے ہوتے...... جو مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے۔ اور میں دیر تک ان ڈراؤنے خوابوں سے باہر نہیں نکل پاتا — ان دنوں میں نے ایسے کئی ڈراؤنے خواب دیکھے جن میں کچھ کا ذکر آگے آئے گا۔ مگر یہ خواب حیران کرنے والے تھے۔ اور میرے سامنے یہ خواب اس نئی دنیا کا ایک بالکل ہی نیا منظر نامہ پیش کر رہے تھے۔

زندگی کے اس موسم میں بھیانک وارداتوں کے درمیان، کبھی کبھی ہلکی دھیمی بارش کے قطروں کا احساس آپ کو توانائی دینے کے لیے کافی ہوتا ہے — یہ رم جھم بارش کی سوغاتیں آپ کو نئے سرے سے جینے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ اور اس رات ایسا ہی ہوا تھا — تھاپڑ نے ہمت توڑ دی تھی اور رباب زخموں پر مرہم لگانے کی تیاری کے ساتھ

اور ایک بار پھر میں خدا کے آگے سجدہ کرنے کو مجبور تھا کہ اس سفر میں رباب کا ساتھ نہ ملا ہوتا تو میں کتنا ٹوٹ چکا ہوتا۔ بیٹے کی گمشدگی کے باوجود میرے لیے وہ اپنے غم اور صدمے کو بھول گئی تھی۔

سنو نا......

رات گہری ہو گئی تھی۔ باہر کتے بھونک رہے تھے۔

'ہاں بولو......'

ایک سرپرائز دینی ہے تمہیں۔

میں چونک گیا تھا۔ اس خوں آشام موسم میں سرپرائز کی بات؟۔

میں رباب کی طرف دیکھتا ہوں۔

'سنو نا۔ بچے ایک دن بڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ماں باپ کا گھر چھوڑ دیتے ہیں۔'

'ہاں'

'بیٹیاں بھی اور بیٹے — اب تو دونوں ہی اپنی اپنی منزلوں اور زندگیوں کے لیے گھر چھوڑ دیتے ہیں۔'

'ہاں'

'میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ اسامہ اپنے کیریئر، اپنی منزل کے لیے باہر گیا ہوا ہے۔ لوٹ آئے گا ایک دن۔'

رباب کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے —

'پھر چلا جائے گا۔ ہے نا...... بچے تو پرندے ہوتے ہیں۔ پرندوں کو روک سکتے ہیں آپ......؟'

'میں نے بھی دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔ شمیمہ یاد ہے......؟'

'ہاں'

'کل شمیمہ کو لے آؤں گی۔'

باہر کتے اب بھی بھونک رہے ہیں۔ میں اچانک چونک جاتا ہوں۔ رباب مسکرا رہی ہے —

'وہ کہاں جا سکتی ہے — میں برابر یہ سوچتی رہی۔ پھر خیال آیا کہ ان لوگوں کے پاس کوئی تو پتہ ہوگا۔ پھر مجھے اس کے ایک جاننے والے کا پتہ ملا۔ وہ دلشاد کالونی رہتے ہیں — جمنا پار — میں بھٹکتے ہوئے وہاں پہنچ گئی۔ اور اتفاق دیکھو — شمیمہ وہاں مل گئی۔ میلے کچیلے لباس میں۔ چہرے پر ہوائی اڑتی ہوئی۔ دو ہی دنوں بعد وہاں سے وہ کلکتہ جانے والی تھی۔'

رباب نے میری طرف دیکھا۔ پھر پلکیں جھکا لیں —

'مجھے یقین تھا، اس بار تم کچھ نہیں بولو گے۔ وہ میرے ساتھ ہی آجاتی۔ مگر اس نے ایک دن کا وقت مانگا۔ ان آنکھوں کا بیان ممکن نہیں — مجھے دیکھ کر کیسے کھل گئی تھی — بالکل ننھی سی بچی کی طرح وہ میرے گلے سے لگ گئی۔'

'تو تم اسے لینے جاؤ گی؟'

'نہیں۔ اس کا ایک چاچا ہے۔ اس کو پتہ اور پیسے دے آئی ہوں۔ شمیمہ گھر آچکی ہے۔ اس لیے پریشانی نہیں ہوگی۔'

رباب کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں — 'اب وہ ساتھ رہے گی۔ اسامہ آئے گا تو اسے بھی اچھا لگے گا۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا۔ ایک بہن لے آؤ میرے لیے۔ مجھے امید ہے شمیمہ ایک بار پھر اس گھر کو گلزار کر دے گی۔'

دوڑتی چلی گئی تھی۔ گھر کو گلزار......؟ وہ بھی ایسے موسم میں جب وحشت کی [illegible] مجھے کمزور کر رہی ہیں اور میری نظر آنے والے فیصلے پر ہے— لیکن میں نے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اٹھ کر بیڈروم میں آ گیا۔ نیند مجھ پر آہستہ آہستہ سوار ہو رہی تھی۔

(۴)

سلسلہ ڈراؤنے خوابوں کا

اور جیسا کہ میں نے ذکر کیا تھا، کئی دنوں سے میں بھیانک خوابوں کی زد میں تھا۔ یہ خواب اتنے ڈراؤنے ہوتے کہ نیند کے عالم میں بھی میری چیخ نکل جاتی — جسم میں لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور جب آنکھیں کھلتیں تو سارا جسم پسینے میں تر بتر ہوتا۔ کچھ خواب حقیقت سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں اور اتنے قریب ہوتے ہیں کہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ خواب ہیں یا حقیقت — اس لیے معزز قارئین، یہ آپ پر منحصر ہے کہ مندرجہ ذیل سطور میں جن بھیانک خوابوں کی تفصیل آپ پڑھنے والے ہیں اسے آپ کن معنوں میں لیتے ہیں— ایک سہمے ہوئے آدمی کا ڈراؤنا خواب— یا پھر آپ اس خواب میں زندہ حقیقتوں کی شناخت کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان دنوں خواب اور حقیقت میں فاصلہ ہی کتنا رہ گیا ہے—

وہ خواب تھا یا حقیقت کہنا مشکل تھا—

تھاپڑ تاریخی فیصلے کے بارے میں اپنی گفتگو کا دھماکہ کر کے جا چکا تھا۔ اور رباب نے شمیمہ کے ذکر سے موجودہ صورتحال کو کسی قدر قابو میں کرنے کا کام کیا تھا—

اس رات موسم ابر آلود تھا—

اور باہر کتے زور زور سے بھونک رہے تھے—

اور اس رات [illegible] سورج گرہن بھی لگا تھا— چینلس بریکنگ نیوز میں مکمل سورج گرہن کو آنے والے، مستقبل کے خطرات اور اندیشوں سے وابستہ کر چکے تھے—

نیند کے عالم میں سب سے پہلے مجھے یہ مکمل سورج گرہن دکھائی دیا— تاریکی میں، گم ہوتی شعاؤں میں جیسے ہزاروں کی تعداد میں آسیب اکٹھے ہو گئے تھے......

یہ آسیب میری طرف دیکھ رہے تھے—

پھر اچانک بے ہنگم صدائیں ٹھہر گئیں—اب تھاپڑ کا چہرہ روشن تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا—

'سنو ارشد پاشا— میں تمہیں ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں— مگر سنو۔ اور یاد رکھو۔ وہاں تم گاندھی جی کے تین بندر کی طرح ہو گے۔ دیکھو گے مگر نہیں دیکھو گے— اور بولنا تو ہے ہی نہیں۔ تم صرف دیکھو گے اور بھول جاؤ گے۔ سنو گے مگر نہیں سنو گے— سنو گے اور دھول کی طرح اڑا دو گے۔'

میرے جسم میں کپکپی طاری تھی۔ 'میں سمجھا نہیں تھاپڑ۔ اور مجھے ایسا کیوں کرنا پڑے گا۔'

تھاپڑ مسکرایا— 'کیوں کہ ہم ایک سیکرٹ مشن پر جائیں گے۔ وہاں گنے چنے صحافیوں کو بلایا جاتا ہے اور یہ صحافی بھی اس سیکرٹ مشن کو بخوبی جان رہے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کو لے کر اس پارٹی میں جا نہیں سکتا۔ مگر گھبراؤ مت۔ میں تمہارے لیے خصوصی اجازت نامہ حاصل کروں گا۔'

'ہونہہ'

[illegible]

تھاپڑ سنجیدہ تھا— 'اور دیکھو تو...... کبھی [illegible] ہم [illegible]

ہیں۔ اخبار پڑھتے ہیں— خبریں سنتے اور پڑھتے ہوئے کبھی کبھی ہم بھی سونامی لہروں کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں۔ ہے نا؟ حساس اور جذباتی لیکن مورکھ— پرلے درجے کے مورکھ— ہم اس سیاست کو قریب سے جان رہے ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بیوقوف بنے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی خبروں پر آنکھیں چڑھ جاتی ہیں— دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں—'

میں ابھی بھی تھاپڑ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا—

تھاپڑ نے میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ اس بار وہ مسکرایا تھا۔ 'کیونکہ حقیقت جانتے ہوئے بھی ہر بار ہم دوستوفسکی کا ایڈیٹ بننے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اس لیے میرے بھائی۔ گاندھی جی کے تین بندر...... برا مت دیکھو۔ برا مت سنو۔ برا مت بولو— وہ ہنس رہا تھا— دیکھنا اور سننا ہے بس— بولنا نہیں ہے۔'

اندھیرے میں روشنی کا حملہ ہوتا ہے۔ تھاپڑ کے ساتھ ماسک لگائے چہرے ہوتے ہیں۔ ڈراؤنے— ان کے ساتھ تھاپڑ بھی قہقہہ لگا رہا تھا—

بدن میں ہزاروں چیونٹیاں سرسرا رہی ہیں۔

'انتخاب قریب ہے۔ سمجھ رہے ہو نا...... اور ...... سب کچھ تم ان آنکھوں سے دیکھو گے...... ننگی آنکھوں سے ...... تمہیں معلوم ہے نا— ننگی آنکھوں سے سورج گرہن دیکھنے کو منع کیا گیا ہے......'

'ہاں'

لیکن وہاں اس کی اجازت ہوگی تمہیں۔ لیکن تمہارے ہوش وحواس تمہارا

[illegible] ...... ہا ہا

تھاپڑ ہنس رہا ہے—

جسم میں میزائلیں گرج رہی ہیں—

بارودی دھماکے ہو رہے ہیں—

باہر کتے بھونک رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ کوئی منظر اتنا ڈراؤنا کیسے ہوسکتا ہے......؟

'سیاست ہر بار ڈراؤنی ہوتی ہے۔ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک اور بھیانک۔'

'ہونہہ— 'لفظ خاموش ہیں۔

'چلو میرے ساتھ۔'

'ہونہہ'— میرے جسم میں اس وقت لہو کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔

'اور باقی باتیں تمہیں سمجھا دی گئی ہیں۔'

'ہاں'

'وہی...... گاندھی جی کے تین بندر!'

'جو ہم ہمیشہ سے ہیں۔'

تھاپڑ نے قہقہہ لگایا۔ 'سمجھدار ہوتے جا رہے ہو۔'

●●

باہر اس کی گاڑی لگی تھی— ہم گاڑی میں بیٹھ گئے— رات کے اندھیرے میں گاڑی انجانی سمتوں کی جانب بھاگ رہی تھی— اور یقیناً اس وقت میرے جسم میں طوفان آیا ہوا تھا۔

یا یوں کہنا چاہیے— تھاپڑ کی باتوں نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں

[illegible]
کی شروعات ہوگئی تھی۔

ایک مہذب ترین دنیا میں کھیلا جانے والا بھیانک ڈرامہ......

بے ہنگم آوازیں چاروں طرف سے مجھے حصار میں لے رہی ہیں — میں کروٹ بدلتا ہوں — اور اب میں دوسرے منظر کی زد میں ہوں۔

ایک دوسرا منظر —

یا خوفناک خوابوں کا ایک نہ ختم ہونے والا دوسرا سلسلہ......

لیکن کیا جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں۔ وہ سچ ہے۔

معاذ اللہ۔ یا خدا...... میرے رب...... میری آنکھیں چھین لے — میرے رب...... اور......

جیسے حسین الحق کی کہانی کا ایک کردار زور سے چیختا ہے —

'سنکٹ کا سمے ہے۔ شنکر میری آنکھیں واپس مت کرنا۔'

میں اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

••

اور میرے پیارے قارئین،

مندرجہ ذیل سطور میں اب جس بھیانک خواب کی تفصیل پڑھنے جا رہے ہیں، ممکن ہے تو مت پڑھیے — یہ ڈرا کیولا کی کہانی سے زیادہ بھیانک ہے — کسی آسیبی فلم سے زیادہ خطرناک۔ رونگٹے کھڑے کرنے والا......

میں تھاپڑ کے ساتھ اس بڑے سے ہال میں داخل ہو گیا تھا۔

اور میری آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔

اس بڑے سے ہال میں کسی سیون اسٹار ہوٹل کی چمک دمک سے بھی زیادہ رنگینیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ فرش پر بچھی ہوئی قیمتی قالین۔ فانوس۔ مہنگے قیمتی صوفے۔ جابجا پتھر کی مورتیوں کے ساتھ سجے ہوئے کھانے کے سامان — گفتگو اور ٹھہاکوں کی آوازیں — اور جیسا کہ آپ جان چکے ہیں یہ پارٹی ایسے موقع پر دی گئی جب ملک مکمل سوریہ گرہن کی کہانی لکھ چکا تھا — اور انتخاب میں کچھ ہی مہینے باقی رہ گئے تھے — اس پارٹی میں میڈیا اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے منتخب لوگوں کو ہی دعوت دی گئی تھی۔ اور جیسا کہ تھاپڑ نے مجھے بتایا تھا — انتخاب نزدیک ہے — ایک پارٹی کو برسر اقتدار آنا ہے اور ایک پارٹی حزب مخالف کا رول ادا کرے گی۔ اور ارشد پاشا...... تم سب کچھ دیکھو گے، مگر خاموش رہو گے......

میری آنکھیں پارٹی میں موجود ہر شخص کو دیکھ رہی تھیں۔ ان میں ہر شخص اپنے اپنے میدان کا بڑا کھلاڑی تھا۔ بزنس کا برانڈ امبیسڈر — مختلف صوبوں میں اپنی نمائندگی ثابت کرنے والے۔ بڑے بڑے اخباروں کے مدیر — صحافی — سیاست کے علمبردار — الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے تمام بڑے چہرے۔ جیوتش — گیانی — چینلس کے مالک...... اور — ٹھہاکوں کی آوازیں —

یہ نمہانی براورز ہیں نا......؟

ہاں......

مندر والے بھی ہیں —؟

اس بار تھاپڑ نے غصے سے میری طرف دیکھا تھا — 'میں نے جو کچھ کہا، وہ یاد نہیں'

ایک گہری خاموشی مجھ پر حاوی ہوگئی — مگر میری نگاہیں اب بھی چاروں

میڈیا کے تمام بڑے چہرے —— بوفورس کے سوداگر ——

تمام بڑے بزنس مین ——

کچھ غیر ملکی مہمان بھی۔ جیسے بطروچی کے بھتیجے/ اور کچھ ایسے بھی جن کے

ناموں سے میڈیا اپنی بریکنگ نیوز تیار کرتا ہے......

پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ اور مجھے اب چکر آنے بھی شروع ہو گئے تھے۔

حلوائی، کسما بن راج۔ ورون کیتلی، ساحل گاندھی، ترون گاندھی...... اور وہ

......سخت سنگھ...... بھانو پرساد یادو...... ناکام پاسبان...... وہ امام صاحب...... اور وہ

......ہندو مہا سبھا کے لوگ...... پنچ تنتر سے لے کر پرانی دنیا اردو تک کے مدیر......

نمبائی برداز گلے مل رہے ہیں......

اور وہ آیو جا...... سانا......

اور اچانک میں ٹھہر گیا ہوں...... مسجد کمیٹی کے سنجیدہ نظر آنے والے

چہرے —— ہندو مہا سبھا اور مندر کمیٹی کے لوگوں کے ساتھ ٹھہاکے لگاتے ہوئے۔

کیا میں انہیں سن سکتا ہوں؟

کیوں نہیں ——

کیا ان کے قریب جا سکتا ہوں۔؟

'بالکل......'

اب میں ان کے قریب ہوں۔ ان کی باتیں سننا چاہتا ہوں......

تھاپڑ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

پہلے ڈھنگ سے تماشائی تو بن جاؤ۔ ابھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔' اس نے

ہاتھ تھام لیا ——

ادھر آؤ ——

میں اس کے قدموں کا تعاقب کرتے ہوئے ٹھہر گیا۔ اور جیسے سناٹا میرے

وجود پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

وہ ہنس رہے تھے۔ قہقہہ بکھیر رہے تھے۔ یہاں سیاست گم تھی۔ سب مداری

تھے۔ کسی میں کوئی فرق نہیں تھا۔

ہندو مہا سبھا کے لکھی بھائی، راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے کاندی، رام جنم بھومی

مندر کے آچاریہ، اور مسجد کمیٹی کے کچھ اراکین۔

ہاتھ میں جام۔ ٹھہاکے لگ رہے ہیں ——

' ارے دیش کی فکر کرو '

'جیب کی فکر نہ کریں۔ سب جیب سے چلتا ہے۔'

'بالکل سچ کہا۔ جیب بھاری تو سب اپنی مٹھیوں میں۔'

ٹھہاکہ ——

' آپ نے تھال میں سجا کر مندر ہمیں دے دیا۔ '

کیسے نہیں دیتا بھائی —— بھاؤ سے میٹنگ ہوئی تھی۔ بھاؤ بھی تو یہی چاہتے

تھے۔'

ٹھہاکہ......

' دراصل آپ بھی یہی چاہتے تھے۔ '

اور آپ نے اس کی منہ مانگی قیمت بھی تو لے لی۔ سارے سگے سمبندھیوں

'آپ دے رہے تھے، ہم مانگ رہے تھے'

'اور آپ بھی تو دے رہے تھے۔ ایک مشت اس ملک کی تقدیر۔ کیوں جگو بھائی—؟'

ٹھہاکہ—قہقہہ—

'ادھر دیکھو—'تھاپڑ نے اشارہ کیا—

مونیا گاندھی، الکا گاندھی، ترون، اور ساحل، حلوائی اور بخت سنگھ یادو کے ساتھ کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ کچھ اور پارٹیوں کے لوگ بھی اس مسکراہٹ کا حصہ تھے۔

'اب دیکھیے—آپ نے اپنا ٹرم پورا کرلیا'

'ہاں تو آپ بھی پورا کیجئے نا۔'مونیا گاندھی نے ہنستے ہوئے کہا۔ 'آپ اور ہم—پارٹی بدلتی رہے گی—ایک پارٹی آپ ایک پارٹی ہم—'

'اور ہماری پاری کب آئے گی۔'یہ بخت سنگھ یادو تھے۔

بھائی آپ تو صوبے کی سیاست میں رہتے ہیں۔ آپ اپنے ہی بندھوں میں الجھ گئے۔ فلم والے ہوگئے۔'

'ہمیں کیا پتہ تھا'

ٹھہاکا گونجا—

'اس نے راستہ ہی ایسا دکھایا کہ پھنستے چلے گئے۔'

'تو اب اپنی پاری کا انتظار کیجئے'

حلوائی ہنسے—آپ نے سارے ملک کو گھوٹالوں میں الجھا دیا۔ اتنا گھوٹالہ تو ہم نے کبھی نہیں کیا۔'

'مونیا گاندھی نے ہنستے ہوئے کہا—ہمارے پاس پوری سی بی آئی رپورٹ ہے۔'

'سی بی آئی—حلوائی ہنسے—سی بی آئی بیچاری اور کرتی کیا ہے۔ آپ کے ٹکڑوں پر پلتی ہے۔ آج آپ—کل ہماری باری'۔

'تو اس بار ہم آپ کو راستہ دے رہے ہیں نا'۔

'راستہ آپ نہیں دے رہے ہیں۔ جنتا دے رہی ہے۔ اور یہ سب پہلے سے ہی طے ہے۔ طے کرکے آپ ہی نے ہمیں آگے کیا۔ بھول گئے—مونیا ہنس رہی تھی۔ انڈیا شائننگ کے نعروں کے باوجود آپ کو یہ تلخ حقیقت پتہ تھی کہ تنہائی اور بہت سارے دوسرے آپ کے خلاف مورچہ لینے کے لیے تیار ہیں—آپ نے گیند ہماری طرف بڑھا دی......'

ہو......ہو......حلوائی مسکرائے—عینک کے اندر ان کی آنکھیں بے حد معصوم لگ رہی تھیں۔

'سب کچھ پہلے سے طے شدہ—اور آپ کو پتہ تھا کب کتنے گھوٹالوں کی پرتیں آپ کو کھولنی ہیں۔'

'ہو......ہو......'

'کل آپ کو بھی یہی کرنا ہے۔ اور وہ بھالو سنگھ یادو—بھائی، سب اپنے اپنے گھر کی ذمہ داریاں ہی تو ادا کر رہے ہیں۔'

'لو۔ میں کب خلاف ہوں ان سے۔'مونیا کی آزادانہ ہنسی میں حلوائی اور بخت سنگھ یادو بہتے چلے گئے۔

بخت سنگھ یادو نے پہلی بار منہ کھولا—لیکن اس بار ہمیں بھی چانس چاہئے

'پہلے بہن جی سے راستہ تو لیجیے۔'

'راستہ بھی آپ دلوائیں گی۔' سخت سنگھ یادو سنجیدہ تھے۔

'بہن جی بھی تاش کے وہی پتے چلتی ہیں۔ جوان سے ہم چلنے کو کہتے ہیں مگر کبھی کبھی بے دردی سے وہ اپنے کھیل بھی کھیلنے لگتی ہیں۔'

'بہنوں کو سکھانا آسان نہیں۔ کولکتہ ہو یا ممبئی۔ حلوانی ہنسے —— ہم تو سب کا کرشمہ جھیل چکے۔'

'جیا بھارتی کا کرشمہ بھی۔'

'اب سیاست میں سنیاسینوں کا کیا کام...... حلوانی ہنسے۔' کچھ لوگ اپنی چلتے ہیں۔ اور ایسے لوگ ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں۔ انہیں سیاست میں نہیں آنا چاہیے —— یہ سیاسی کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔ ہمیں دیکھیے۔ رتھ پر چڑھے۔ پاکستان گئے تو جناح کے مزار پر ہولیے۔ جناح کے مزار کی چادر لے کر انڈیا آئے تو احساس تھا' ایک تیر سے کئی شکار۔'

'وہی تو ——' مونیا نے گہری سانس لی۔

'لیکن اپنی ہی پارٹی۔ پہلے سے سب کچھ طے شدہ ہونے کے باوجود کھیل کی دشا بدل گئی۔'

'کچھ لوگ مورکھ ہوتے ہیں۔ جاننے کے باوجود کھیل کی دشا بدل دیتے ہیں —— حلوانی سنجیدہ تھے —— جانے دیجیے ——'

'اچھا وہ فیصلے کی بات ہوگئی۔؟'

'فیصلہ......'

'ارے وہی۔ جس کو ہم اپنے پارٹی کے اصولوں کے طور پر گھما رہے ہیں۔'

'تمہیں نبھا رہے ہیں......'

'ہاں وہی۔ مندر مسجد۔ فیصلہ...... اُف آپ نے اٹھارہ سال لگا دیے۔'

'کیا آپ سچ مچ چاہتے تھے فیصلہ ہونا......؟'

'نہیں۔'

'اور اب بھی وہی ہوگا جو آپ چاہیں گے...... عدلیہ اور انتظامیہ کی باتیں ہم پر چھوڑ دیے۔'

'ہو...... ہو......'

'لیجیے۔ وہ بنگھل صاحب اور امام صاحب بھی ادھر ہی آرہے ہیں۔'

'آنے دیجیے۔'

باہر کی دنیا میں یہ سب ایک دوسرے کے کٹر دشمن —— لیکن یہاں......' بی۔ ام۔ کے کی ایک پارٹی ورکر نے کہا۔

'یہاں سب دوست ہیں۔ عوام کے لیے جو چہرہ ہو۔ وہ عوام جانیں۔ سب کو اپنے اپنے تاش کے پتے دے دیے گئے ہیں اور سب اسی پتے کی حکومت تسلیم کر رہے ہیں —— ہم اور آپ بھی تو وہی کر رہے ہیں۔'

حلوانی کی آنکھیں چشمہ کے اندر پھر سنجیدہ تھیں ——

'لیکن اس بار پردھان منتری بننے کا خواب ——؟'

'ہم تھال میں سجا کے حکومت آپ کو دے سکتے ہیں۔ باقی کام آپ کو دیکھنا ہے۔'

'ہو...... ہو......' حلوانی مسکرائے۔

'السلام علیکم۔'

مسجد میٹی اور مندر میٹی کے دونوں نامور چہرے ہنستے مسکراتے ہوئے سامنے تھے۔

’ فیصلہ دیکھ لیجئے گا — ہمیں بھی قوم کو جواب دینا پڑتا ہے۔‘

’اور ہمیں بھی۔‘

’ تو فیصلہ آپ دونوں مل کر ساتھ کیجئے — ‘ ہنسی کی آواز ابھری — ’وہی فیصلہ سنا دیا جائے گا۔‘

ٹھہاکے۔ شور......

تھاپڑ نے آہستہ سے میرے ہاتھوں کو تھاما — ’ چلو میرے ساتھ۔ ابھی تو بہت کچھ دیکھنا باقی ہے......‘

’ اب — اب کیا دیکھنے کو باقی رہ گیا ہے۔ ‘

’ابھی دیکھا ہی کہاں ہے ‘

وہ مجھے لے کر کنارے آ گیا —

’تمہاری سانس پھولتی ہے ہر بات پر — ٹی وی دیکھتے ہو تو چکر آ جاتا ہے — اخبار پڑھتے ہو تو لرز جاتے ہو — یہاں وہ بھی ہیں جنہوں نے گھوٹالے کیے — وہ بھی جنہوں نے سزا تجویز کی — یہاں سب ایک تھالی میں کھا رہے ہیں — سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے — مندر مسجد — لڑتے ہم تم ہیں — جذباتی ہم تم ہوتے ہیں — اور یہاں...... سب ایک — سب پہلے سے طے شدہ...... وہ دیکھو......

وہ نمبانی برادرز......؟

’ ہاں۔‘

جھگڑا ہے......؟

ہاں

’کوئی جھگڑا نہیں ہے — ایک پارٹی کی دم پکڑتا ہے۔ دوسرا سر۔ ایک کان کو پیچھے سے پکڑتا ہے اور دوسرا آگے سے‘

تھاپڑ ہنسا۔ ’یہاں وہ سارے چہرے موجود ہیں، جنہیں تم بڑے لوگ کہتے ہو۔ اپنے اپنے شعبے کے بڑے لوگ...... وہ بھی جن سے تم محبت کرتے ہو۔ اور محبت اس لیے کرتے ہو کہ آئے دن وہ تمہیں سہلاتے رہتے ہیں — اور وہ بھی موجود ہیں جن سے تم حد درجہ نفرت کرتے ہو۔ اس لیے کہ وہ تمہارے لیے نفرت بوتے رہتے ہیں۔ مگر یہاں دونوں ہیں۔ ایک ساتھ۔ ہاتھ میں ہاتھ دیے......‘

وہ دیکھو......

سیاسی چہرے —

برانڈ امبیسڈر —

بزنس ورلڈ کے بادشاہ —

انڈر ورلڈ کے لوگ......

ان میں کچھ فلمی چہرے بھی ہیں — وہ دیکھو......

اور وہ...... تمہارے میڈیا کے رہبر — اخباروں کے مدیران...... وہ اخبار بھی جن کی سرخیوں پر تم ایک طرح کا تحفظ محسوس کرتے ہو۔ اور وہ بھی جو اپنی زہریلی سرخیوں سے تم، تمہاری قوم کو جلاتے رہتے ہیں — لیکن یہاں۔ ان سرخیوں کا کرشمہ دیکھ لو — سب طے شدہ۔ ایک کو ایک بھومیکا انجام دینی ہے۔ اور دوسرے کو دوسری......‘

آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا—

'دیکھو' تھاپڑ چلایا— 'لڑکھڑانے سے کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ ہارر شو دیکھو۔ کسی بھی انتخاب سے پہلے کا ایک ہارر شو— صرف پارٹی اور بھومیکا ئیں بدلتی ہیں۔ سب ایک ہیں۔ اور ہم کیا ہیں......'

آنکھوں کے آگے ہزاروں بھوت تانڈو کر رہے ہیں۔ مونیا گاندھی ۔حلوائی— کسما بن راج......

بھوت تانڈو کر رہے ہیں......

ڈرم......ڈرم......

مندر اور مسجد تحریک سے وابستہ لوگ......

بھوت تانڈو کر رہے ہیں—

سیاست کے وہ چہرے، جن پر اب تک بھروسہ کرتا آیا تھا—

بھوت رقص کر رہے ہیں......

وہ چہرے جنہیں اپنا جانتا تھا کہ یہ میری لڑائیاں لڑ رہے ہیں— میری قوم کی لڑائیاں......

ڈرم......ڈرم......

کمزور آواز سر نکالتی ہے—

'کیا یہ سب ایک ہیں؟'

'ہاں—'

'اور پارٹی......؟'

'پارٹی بھی ایک......'

'سب ایک......'

'نیشنل کانگریس پارٹی......؟'

'سب ایک......'

بھومیکا ئیں......؟ ڈری آواز سہمی ہوئی آواز—

'بس بھومیکا ئیں بدل جاتی ہیں۔ اور یہاں اس وقت یہی ہو رہا ہے۔ یہاں طے ہو رہا ہے۔ آنے والے کل میں کس کی حکومت ہوگی۔ کون پارٹی برسر اقتدار آئے گی۔ جو حکومت کرے گی، اس کی بھومیکا ئیں کیا ہونگی۔ جو پارٹی حزب اختلاف میں ہوگی، اس کا رول کیا ہوگا......'

'اور......'

'اور یہ کہ میڈیا میں کون کیا لکھے گا۔ کون مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھے گا کون کس کو سہلائے گا۔ کون کس کو رلائے گا...... دیکھتے جاؤ۔ یہاں سب کچھ ۔ کچھ ہی دیر میں طے ہونے والا ہے......'

'کیا یہ سب یہاں موجود سارے لوگ جانتے ہیں؟'

'ہاں'

'اخبار والے بھی......؟'

ہاں

'چینلس والے بھی؟'

'ہاں'

'یہ مناجیش...... عدلیہ کے لوگ۔ جیوتشا چاریہ...... سنگھ اور بزنس ورلڈ سے وابستہ لوگ......؟

'ہاں۔اس حقیقت سے سب واقف ہیں'

'ہاں—— کہ بس پارٹی بدلتی ہے——؟'

' ہاں بدلتی صرف پارٹی ہے۔ جنتا ایک پارٹی سے بور ہو جاتی ہے۔ پھر دوسری آتی ہے——اس لیے بھومیکاؤں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے......'

یعنی...... یہاں موجود ہر شخص جانتا ہے......؟' آواز بوجھل ہوگئی ہے۔ سرد۔ برف جیسی۔

'یہاں موجود ہر شخص جانتا ہے۔'

'پھر——؟'

' پھر کیا؟'

میں نے تھاپڑ کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

'پھر یہ سچ ہم کیوں نہیں جانتے——؟'

' نٹوے ہیں ہم——تھاپڑ نے گالی بکی——' جنتا سب جانتی ہے۔لیکن عام جنتا کی حالت کسی جمڑوے جیسی ہے۔ جو جانتی سب ہے پھر بھی کٹ پتلی کا تماشہ بنتے ہوئے اسے مزہ آتا ہے——اور اسی لیے نچاتی ہے یہ سیاست۔ اور یہ لوگ——'

' تو میں بھی ناچوں......؟'

' ہاں۔'

آگے بڑھ کر ویٹر سے دو گلاس تیار کرنے کے لیے کہا......

شراب کی بوند زہر کی طرح اندر جا رہی ہے......

میں ناچوں نا......؟

ہاں...... یہاں سب ناچ رہے ہیں......

رقص —— رقص میں لیلیٰ رہی...... لیلیٰ کے دیوانے رہے......

ذرا جھک کے دکھا...... ذرا ٹھمکا لگا......

چیرئس...... ایک پیگ...... دو پیگ...... تیسرا پیگ...... جسم جھول رہا ہے......

تین پیگ پینے کے باوجود کہیں کوئی نشہ نہیں—— دماغ میں میزائلیں چھوٹ رہی ہیں۔

سب سے بڑی جمہوریت والا ملک...... ذرا جھوم کے دکھا...... تھاپڑ یار...... تم بھی تو لڑکھڑا رہے ہو...... سب سے بڑی جمہوریت —— آزادی کے بعد بھی تقسیم کا دور —— ملک کی ہر بڑی پارٹی تقسیم ہوتی رہی —— 1978 کے بعد سے تین بار کانگریس کو تقسیم ہوتے دیکھا —— 1989 کے بعد جنتا دل تقسیم پر تقسیم ہوتا گیا۔ جن سنگھ کے خیالوں سے جنمی بھگوا پارٹی بھی اپنے اصولوں میں تقسیم ہوتی رہی۔ اور کتنی عجیب بات...... ملک، ہندستان، بھارت اور انڈیا میں مسلسل تقسیم ہوتا رہا ہے۔ شہر بدل گئے۔ چمک دمک بدل گئی۔ جبکہ 70 فیصدی گاؤں میں غریبی بڑھی ہے۔ یہاں آج بھی دنیا کے 44 فیصد غریب رہتے ہیں۔ اور کتنی عجیب بات...... ہم مسلسل تقسیم ہو رہے ہیں......

رقص میں لیلیٰ رہی......

لیلیٰ کے دیوانے رہے......

تقسیم ہونے کے باوجود سب ایک ہیں۔ ایک چہرے...... ایک نام...... ایک پارٹی...... آنکھوں میں گھنے اندھیرے اتر آئے ہیں —— میں لڑکھڑاتا ہوا تھاپڑ کی طرف دیکھتا ہوں۔

کیا ہم سچ مچ سب جانتے ہیں؟

ہاں......

کیا ساری پارٹیاں ایک ہیں......؟

ہاں......

'تو پھر ہمارے جذبات کیوں تقسیم ہو [illegible] سکتے ہیں؟ — [illegible] ایک [illegible] تو ایک پارٹی ہمارے نفرت کی مستحق بن جاتی ہے اور دوسری میں ہم اپنا مستقبل دیکھنے لگتے ہیں۔'

' ہونہہ۔ ایک کی بنیاد ہی وش پر ہے۔ لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ جو دوسری پارٹی ہے...... اس کی بنیاد بھلے وش پر نہ ہو مگر وہ زیادہ زہریلی ہے ...... یہ بھی تو دیکھو کہیں کوئی فرق نہیں — سب ایک ہیں۔ ایک زہر اگلتی ہے یہ زہر اگلنا بھی پہلے سے طے شدہ رہتا ہے اور دوسری مرہم لگاتی ہے تو یہ بھی پہلے سے ہی طے ہو چکا ہوتا ہے ......'

میری آواز کمزور تھی۔

'پھر ہم انتخاب کا انتظار کیوں کرتے ہیں۔ ووٹ دینے کیوں جاتے ہیں —؟ ہم ایک ناجائز سسٹم کا کھوکھلا ووٹ بینک بن کر کیوں رہ گئے ہیں —؟'

'تماشہ۔ ایک بڑا جشن۔ اور ہم ہنستے مسکراتے اس جشن کا حصہ بن جاتے ہیں۔ برسوں سے یہی ہوتا رہا ہے۔ بھیس بدل بدل کر ایک ہی پارٹی اس ملک پر حکومت کرتی رہی ہے۔ اور ہم ہر بار دیوانوں کی طرح اپنے جذبات کا مظاہرہ کرتے رہے ...... کرپشن، گھوٹالہ ...... ملک کو فروخت کرنے والے مہنگائی، مندر مسجد، گجرات، کو فورس سے فرقہ وارانہ دنگوں تک — اخبار پڑھتے ہوئے مٹھیاں کس جاتی ہیں — ٹی وی دیکھتے ہوئے آنکھوں میں کسی کے لیے حیرانی جاگتی ہے، کسی کے لیے نفرت — کوئی بیگانہ لگتا ہے تو کوئی اپنا — کسی کو قتل کردینے کی خواہش ہوتی ہے۔ تو کسی کے ہاتھوں اپنا مستقبل محفوظ نظر آتا ہے — مگر حقیقت تو دیکھو۔ حقیقت یہاں روشن ہے۔ یہاں سب مل رہے ہیں۔ اور سب کو پتہ ہے، ایک پارٹی کو حکومت میں آنا ہے اور دوسری کو حزب مخالف کا رول ادا کرنا ہے ......

[illegible] چل رہے ہیں

ہنگامے۔ تھبا کے ...... سیاست کی ڈیل چل رہی ہے۔ ہر شعبے کے لوگ ہیں۔ بزنس سے قلم اور مذہب سے سیاست تک —

چیئرز۔

ایک پیگ۔ آنے والے کل کے لیے —

اور دوسرا — عوام کے لیے۔ سلامتی کے لیے —

تیسرا ...... روپیوں کے لیے ...... سب سے بڑا روپیہ ......

اب سب ناچ رہے ہیں۔

صرف میں ٹھہر گیا ہوں — میں اور تھاپڑ —

قدیم قبیلے جاگ گئے ہیں۔ پاشان یگ۔ آدی مانو ...... ازلی انسان ......

رقص میں لیلیٰ رہی ...... لیلیٰ کے دیوانے رہے ......

میں تھاپڑ کی طرف مڑتا ہوں ...... 'اب مجھے اسامہ کا خوف نہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ وہ اس بھیانک سسٹم اور انتظامیہ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی کہیں اپنی موجودگی درج کرا رہا ہے — تواریخ کے کسی انجانے صفحے پر — ممکن ہے یہ موجودگی کل سب کی نظروں میں آجائے —'

لوگ جھوم رہے ہیں ......

ناچ رہے ہیں ......

میں لڑکھڑاتا ہوا سامنے کی دیوار سے ٹکراتا ہوں ......

●●

آنکھیں کھل گئی ہیں —

باہر کتے بھونک رہے ہیں —

پتہ نہیں رات کس دوران [illegible]

میں قریب لیٹا ہوا رباب کو دیکھتا ہوں۔ میرا جسم پسینے میں ڈوب چکا ہے......

اور اس خیال سے باہر نکلنا مشکل کہ میں نے ابھی کچھ لمحے پہلے جو کچھ بھی دیکھا، وہ محض ایک خواب تھا۔

مگر اس دوران ایسے لامتناہی خوابوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ میرے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔

تب تک فیصلہ نہیں آیا تھا۔

(۵)

"یہ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ جس پر چلنے سے فرشتے بھی ڈرتے ہیں۔ زمین میں چاروں طرف بارودی سرنگیں بچھی ہیں۔ ہم سے کہا گیا ہے کہ اسے صاف کیا جائے۔ کچھ سمجھدار لوگوں نے صلاح دی ہے کہ اسے صاف کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ لیکن یہ خطرہ اٹھانا ہوگا۔"

تاریخی فیصلہ سنانے والے جج سبغت اللہ خاں کے شروعاتی بیان کا حصہ۔

یہ صبح عام صبح جیسی نہیں تھی۔ ایک انقلاب ریت کے سمندر سے سر نکال رہا تھا۔ فضا گرد آلود تھی...... اور سرخ آندھیوں نے اپنے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ ملک ایک بار پھر بارود کے دہانے پر تھا۔ سہمے ہوئے چہروں پر دعائیں کانپ رہی تھیں۔ نیند سے اٹھا تو دہشت کا چہرہ آنکھوں میں تھا۔ یہ چہرہ مجھے خوفزدہ کرنے کے

لیے کافی تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو مسکراتی ہوئی رباب کے ساتھ ہاتھوں میں چائے لیے شیمہ کھڑی تھی۔ اور یقیناً اس لمحے اسامہ کو سوچتے ہوئے میری دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

'ابو چائے......'

اس کے پیچھے کھڑی ہوئی رباب مسکرا رہی تھی۔

'یہ چائے شیمہ نے خود بنائی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے'

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

'اللہ تمہیں تقدیر کا بڑا بنائے بیٹی۔'

میں نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی — لیکن کامیابی نہیں ملی۔ میں باہر نکل کر آج کے ماحول کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

بابری مسجد اور اجودھیا کے زخم تازے ہو گئے تھے۔ تاریخ کا اعلان ہوتے ہی فوجی دستے چاروں طرف چھا چکے تھے۔ پولس گشت بڑھا دی گئی تھی۔ اجودھیا جانے والے بھی راستوں پر بیریئر لگا دیے گئے تھے۔ پولس اور پی اے سی کے جوان چوکنے تھے۔ لوگوں کی تلاشیاں لی جا رہی تھیں۔

ٹی وی پر بریکنگ نیوز میں بابری مسجد فیصلے کو لے کر ماحول کو پرسکون بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ لیکن کیا سچ؟ خبروں سے کچھ ایسا اشارہ دیا جا رہا تھا کہ اس بار فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوگا۔ بٹلہ ہاؤس اور آس پاس کی گلیاں سنسان تھیں۔ بازار کھلے تھے لیکن ایک عجیب سے خوف اور دہشت کے رنگ کو چہرے پر دیکھا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر تک یونہی چہل قدمی کے بعد میں گھر لوٹ آیا تھا — دماغ بوجھل تھا۔

اٹھارہ سال پرانی یادیں دل و دماغ پر شب خون مار رہی تھیں — اٹھارہ سال پہلے کی

ان یادوں سے باہر نکلنے کے لیے میں پھر ٹی وی کا [illegible] ٹی وی پر اجودھیا اور وہاں کے ماحول کے بارے میں بتایا جا رہا ہے— اجودھیا میں صبح روز کی طرح ہوئی— لیکن ماحول بدلا ہوا تھا۔ صبح 5:20 بجے کے قریب سرجوندی کے کنارے نیا گھاٹ پر اڑیسہ سے آئے 50-55 لوگوں کا پہلا جتھا پہنچا—

سبھی عقیدتمند ٹرین سے آئے تھے اور فیض آباد اسٹیشن پر اترنے کے بعد راستے میں ڈھیر ساری حفاظتی چیکنگ سے گزرتے ہوئے گھاٹ پر پہنچے— اڑیسہ کے عقیدتمندوں نے سرجو کے گھاٹ پر آکر نہانے کی بھی ہمت نہیں کی— وہ متنازعہ احاطے میں رام کا درشن کر کے روانہ ہو گئے۔

گھاٹوں پر جہاں صبح 10 بجے تک خاموشی چھا گئی— سناٹے کا منظر طلوع آفتاب کے بعد سے مسلسل بنا ہوا تھا۔ گھاٹ پر واقع رادھا کرشن مندر میں رہنے والے سنت اور سادھو منجیرے کی گونج کے درمیان رام دھن گا رہے تھے۔

صبح گیارہ بجے کے قریب زیادہ تر بازاروں میں دکانیں کھلی رہیں۔ لیکن بند دکانوں کی بھی تعداد کم نہیں رہی۔ ممکنہ خوف کے چلتے کاروباریوں نے مخصوص جگہ پر آنے سے پرہیز کیا۔ سنت تلسی ادھان کے پاس والی سڑک پر صبح سے ہی جلیبی اور کچوڑی کی دکان سجائے ایک لڑکے نے بتایا کہ تھوڑی بہت بکری ہی ہوئی— عقیدتمند تو آئے نہیں— مقامی لوگ بھی کم ہی نکلے۔ کھانے کے ہوٹل مالک کے مطابق گاہکوں کا بالکل ٹوٹا ہے— صبح تک کھلے بازار تین بجتے بجتے بند ہونے لگے— ہنومان گڑھی کے آس پاس سناٹا پسر گیا۔ تین بجے تک تو چڑھاوے کے لیے پرشاد اور مالا بیچنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

ہنومان گڑھی جانے والی خاص شاہ راہوں پر بیریئر گرا دیا گیا— فورس

مستعد تھی— آنے جانے والوں سے پوچھ تاچھ ہوئی— تب آگے بڑھنے کی اجازت ملتی۔ تناؤ کافی تھا— حالانکہ اس بازار میں کھلی اکا دکا دکانیں زندگی کا احساس کرا رہی تھیں۔ فیصلے سے کچھ پہلے فورس کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ آر اے ایف، پی اے سی اور پولیس کے جوانوں سے بھری بسیں پہنچنے لگیں۔

کیمرہ اجودھیا کی سڑکوں، گلی کوچوں پر پین ہو رہا تھا۔ لیکن میری آنکھیں کیا تلاش کر رہی تھیں— اسامہ کو؟ کچھ دن پہلے کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔

سراب بھی بھاری تھا— گھوم پھر کر پھر اسی مقام تک آ کر ٹھہر جاتا۔ فیصلے میں کیا ہوگا؟ کس کے حق میں آئے گا فیصلہ—؟

آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا جیسی تنظیموں نے پہلے سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اگر فیصلہ ان کے حق میں نہیں آتا ہے تو وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔ اور اس کے بعد اگر پورے ملک میں گجرات جیسا ماحول بنتا ہے تو یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

کتنے ہی سوال تھے جو راستہ روکے کھڑے تھے۔

اجودھیا کی متنازعہ زمین پر کس کا حق قبول کیا جائے گا—؟ ہندو تنظیموں کا یا مسلم وقف بورڈ کا—؟ چاروں طرف خوف کا منظر ہے— اس فیصلے پر دنیا بھر کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں— فیصلے کے بعد بھی کیا ہمیں کسی قسم کا تحفظ ملے گا؟

دہشت کا چہرہ ایک بار پھر نظروں کے سامنے ہے۔

یقیناً یہ چہرہ اس وقت رباب کی آنکھوں کے سامنے بھی ہوگا— لیکن وہ شمیمہ میں خود کو بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا ہے، دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے—

رباب اور شمیمہ بھی صوفے پر آکر بیٹھ گئے ہیں— سب خاموش ہیں— شاید ایک دوسرے سے نظریں ملانے کی بھی ہمت نہیں۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ تاریخی فیصلہ آنے والا ہے۔ ایک ایک سکنڈ جیسے صدیوں کے برابر ہو گیا ہے...... میں ایک بار پھر خود سے الجھتا ہوں۔ اس فیصلے میں کیا ہے؟ کیوں اس فیصلے کو جاننے کی بیقراری ہے؟

میزائلیں ایک بار پھر گرج رہی ہیں— آزادی کے بعد کا ہندستان سامنے ہے— ہندستان، جہاں کی ایک بڑی اقلیت اپنے حق میں ہونے والے ایک فیصلے کے لیے ترستی رہ گئی—

رم...... جھم...... بارش کی پھواریں میرا راستہ روکتی ہیں۔

اس فیصلے کے بعد بھی محفوظ نہیں ہو تم......

پہلے فیصلہ تو آ جائے—

آنکھیں بند ہیں— کتنی ہی تصویریں روشن ہیں— اس تاریخ سے، اس فیصلے سے ایک ذہنی وابستگی بھی رہی ہے میری— اسامہ کی پیدائش— اس کے ننھے معصوم سراپے کو دیکھنا۔ گود میں لینا۔ اور پھر اسی آزاد ہندستان میں ایک دن اس کا گم ہو جانا...... یہ صرف ایک فیصلہ نہیں ہے—

مجھے ایک تسلی چاہئے— اپنے لیے— اپنے بیٹے کے لیے— اپنی آزادی کے احساس کے لیے—

رباب اور شمیمہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میں اس گہری نہ ختم ہونے والی دھند میں اتر گیا ہوں—

آزادی کے بعد کے فسادات مجھے گھیر رہے ہیں۔

سامنے ہائی کورٹ کی عالیشان عمارت ہے۔ اور اینکر اس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلا رہا ہے......

فیصلہ آچکا ہے۔

ایک تاریخی فیصلہ سننے کے لیے آپ تیار ہو جائیے۔

فیصلہ آنے والا ہے— وہ تاریخی فیصلہ جس کے انتظار میں اٹھارہ سال کاٹے ہیں میں نے— ایک ایسا فیصلہ جس کے لیے عدلیہ نے 8189 صفحات میں اپنا فیصلہ سنایا ہے۔

دھڑکنیں تیز ہیں۔ اندر جیسے اٹھنے والی آندھی بھیانک ہو چکی ہے۔

فیصلہ آنے والا ہے—

دل جیسے ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ میری حالت اس جوکر کی طرح ہو رہی ہے جو نہ ہنس سکتا ہے نہ رو سکتا...... بس وہ ایک تماشہ کا حصہ ہے۔ یا خود تماشہ ہے...... اور اس کو دیکھنے والے مسلسل ہنس رہے ہیں۔ ٹھہا کا لگا رہے ہیں—

قارئین، یہاں ایک بار پھر آپ کو رکنا پڑے گا۔ کچھ باتیں ہیں جن کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ فیصلہ کی رات سے فیصلہ آنے تک ایسی کتنی ہی باتیں ہوئیں جنھیں آپ کے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

جیسے رات کچن میں چوہوں کے شور کے باوجود رباب اطمینان سے شمیمہ سے باتیں کرتی رہی۔ میں بالکنی میں آیا تو......

نہیں ...... یہ میرا وہم تھا...... اور یقیناً آپ میری بات پر بھروسہ نہیں کریں گے—

طرح شک کی نگاہ سے نہیں دیکھیے۔ تارے نہیں تھے۔ چاند نہیں تھا۔ وہاں ایک گڑھا سا تھا۔ نیلی آسمانی چادر کی جگہ ایک بدنما سا گڈھا...... میں اتنا خوفزدہ ہوا کہ اپنے کمرے میں آگیا۔

میں رباب سے کہنا چاہتا تھا...... کہ آسمان تو ہے ہی نہیں۔ یعنی اگر تم میری بات کا یقین نہیں کررہی تو خدا کے لیے بالکنی پر جاؤ۔ اور آسمان کی طرف دیکھو۔'

مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ میں بولنے کی کوشش ضرور کررہا تھا مگر منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

کچھ اور بھی واقعات پیش آئے تھے —

کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا، سیلاب کا پانی کھڑکی کے راستہ اندر کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ میں چیخنا چاہتا ہوں۔ رباب کو آواز دے کر جگانا چاہتا ہوں۔ مگر بے سود۔ سنامی لہریں تب تک ہمیں بہا کر دور لے جاچکی ہوتی ہیں۔ رباب کی آواز پر میں جیسے خواب سے جاگا تھا۔

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو......'

'وہ......' کہتا ہوا میں ٹھہر گیا تھا۔

' پریشان ہونے سے کوئی فائدہ ہے۔ جو بھی ہونا ہے، وہ کل تک سامنے آجائے گا۔

اس رات تین بار مجھے اپنی چوکھٹ سے چوٹ لگی تھی۔ اور اس رات میری گھڑی پھر گم ہوگئی تھی۔ بہت دیر تک تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملی۔

' چلو، نکاحی گھڑی سے چھٹکارا ملا۔ رباب نے ہنستے ہوئے کہا۔ اب مت تلاش کرو۔ کل نئی لے آنا۔'

اچانک رک گیا ہوں۔ رباب غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

'کیا ہوا۔؟'

'کچھ نہیں'

'گھڑی کے گم ہونے سے پریشان ہو......؟'

'ارے نہیں......' کہہ کر سر جھٹکنے کی کوشش کی۔ مگر وقت جیسے ٹھہر گیا تھا —

مجھے یاد آیا، اس دن علوی کے ابو ملے تھے۔ کمزور اور تھکے ہوئے۔ سلام مصافحے کے بعد بابری مسجد فیصلہ کا ذکر آتے ہی ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک جاگی تھی۔

'بس فیصلہ آجائے......'

' لیکن اس فیصلے سے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔'

'یہ فیصلہ میرے حق میں آتا ہے تو احساس ہوگا، علوی کو انصاف مل گیا ہے۔ برسوں سے ساری لڑائی انصاف کی ہے۔ انصاف ہی تو نہیں ملا۔'

آنکھیں نم تھیں۔ پھر علوی کے ابو رکے نہیں، آگے بڑھ گئے — میں یادوں کے جزیرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔

لیکن ہر بار باہر نکلنے کی کوشش میں وہ گھڑی سامنے آجاتی ہے۔

اس بار کہاں بھول آیا —؟ بیسن سے بیڈروم اور صوفے تک سب جگہ تلاش کرنے کے باوجود گھڑی نہیں ملی — وقت دیکھنے کی عادت پڑگئی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب کوئی وقت، میرا نہیں ہے — اندر ایک ہنسی کی آواز ابھرتی ہے۔

فیصلہ تمہارے حق میں آیا تو......؟ تب بھی تم خطرے میں ہو ارشد پاشا۔

اور اگر خلاف آیا تو — تب بھی......

اور تاحد نظر پھیلے آسمان کی جگہ گدھوں [illegible]......

پھر گدھے ہلنے لگے......

جیسے سرخ پانی کی لہریں ہوں — تیز لہریں۔

'ان لہروں سے مسجد جیسی ایک شکل تعمیر ہو رہی تھی......

یقیناً یہ ایک مسجد تھی۔ مسجد کا تعاقب کرتے ہوئے کچھ سائے تھے۔ خوفناک شکلوں والے...... پھر آن کی آن میں مسجد ڈھا دی گئی...... اب وہاں گدھے تھے۔ سرخ گدھے...... اور ان گدھوں کے درمیان......

میں حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے پہچاننے میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ میری گھڑی تھی۔ اور عجیب بات اس کی ٹک ٹک کی آواز...... یہاں تک مجھے سنائی دے رہی تھی......

میں رباب اور شمیمہ کو چیخ چیخ کر آواز دینا چاہتا تھا — شاید میں ہنس رہا تھا...... وہاں دیکھو تو...... میری گھڑی ہے۔ لیکن گھڑی چل رہی ہے...... تم لوگوں تک بھی اس کی ٹک ٹک کی آواز پہنچ رہی ہے نا...... میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے......

میرے پیچھے شمیمہ کھڑی ہے۔

'ابو...... دیر ہوگئی۔ سو جایئے۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی......'

میں پلٹ کر شمیمہ کو دیکھتا ہوں...... ایک لمحہ کو لگتا ہے...... شمیمہ میں اسامہ زندہ ہو گیا ہے۔

میں جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہوں۔ ٹی وی اسکرین روشن ہے۔

اور فیصلہ آچکا ہے......

●●

تاریخی فیصلہ آچکا ہے۔ نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی ہیں۔

زمین کی تقسیم تو ہوئی لیکن رام للہ وہیں رہیں گے۔ 8189 صفحات پر مشتمل رپورٹ میں تمام حقائق سامنے رکھنے کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا کہ وہ جگہ وقف بورڈ کی نہیں ہندوؤں کی ہے — اور درمیانی گنبد سے نیچے رکھی گئی مورتیاں اسی جگہ سے ہٹائی نہیں جائیں گی — عدلیہ نے وقف بورڈ کے مالکانہ حق کے دعوے کو خارج کر دیا۔ متنازعہ زمین ہندو مسلم اور اکھاڑے میں برابر تقسیم کی جائے گی۔ اس طرح دو تہائی حصوں پر ہندوؤں کا حق ہوگا۔ زمین کا ایک تہائی حصہ مسلمانوں کو ملے گا۔ رام للہ کی مورتیوں والا حصہ ہندوؤں کو دیا جائے گا۔ رام چبوترہ، بھنڈار اور سیتا رسوئی پر اکھاڑے کا حق ہوگا۔

میں گہرے سناٹے میں رہوں۔ اس سناٹے کا کوئی انت نہیں۔ کیا عقیدے کو بنیاد بنا کر جمہوریت کا مذاق اڑایا گیا ہے — ؟ اور اس مذاق میں عدلیہ کے تین ستونوں میں سے ایک ستون کے طور پر اقلیت کی آواز بھی شامل ہے — کیا سب کو برابر کا حصہ دے کر خوش کرنے کی کوشش کی گئی ہے — لیکن خوش کون ہے؟ اور ہارا ہوا کون ہے؟ پانچ سو سال سے جو متنازعہ زمین بابری مسجد کی شکل میں سامنے تھی، کورٹ نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنا گوارا نہیں کیا — یہ بھی نہیں کہ جو مورتیاں ۱۹۴۹ء میں وہاں رکھی گئیں وہ وہاں کیسے آئیں — ؟

اس کی دیکھ بھال کرنے والے، زمین کے کاغذات رکھنے والے لوگ تو پیڑھیوں سے موجود رہے — اقلیت ہمیشہ حاشیے پر رہی ہے۔ فیصلہ سن کر محسوس ہوا، جیسے کورٹ کہہ رہا ہے کہ ہندو راشٹر میں آپ کا سواگت ہے — دراصل یہی ہندوستانی سماج کی اصلیت ہے۔ جو لوگ کہہ رہے تھے کہ 1992 میں بابری مسجد گرنے کے بعد

سے معاملہ ختم ہو گیا انہیں آج دیکھنا چاہیے کہ یہ اب کتنی بھیانک شکل اختیار کر چکی ہے۔
دھوکہ...... میں آہستہ سے چلاتا ہوں......

دروازہ پر دستک ہوئی ہے۔ اجے سنگھ تھاپڑ کی موجودگی اس وقت مجھے گراں گزر رہی ہے—

وہ صوفے پر بیٹھ چکا ہے۔ چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری......
لیکن میرے سوئے ہوئے لفظوں کو زبان مل گئی ہے—

'کیا یہ سیاست ہے؟'

'ایک بے رحم سیاست'

'اچھا یہ بتاؤ تھاپڑ۔ اگر یہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوتا تو کیا تم اسی خاموشی سے قبول کر لیتے جس طرح میں نے کیا ہے......؟'

تھاپڑ چپ ہے—

'یہ ملک جیسے تمہارا ہے، ویسے پچیس کروڑ مسلمانوں کا بھی—ایک بڑے تاریخی مقدمے کے فیصلے کے لیے تین لوگوں کو بیٹھا دیا جاتا ہے—ایک جج جو ماتھے پر ٹیکا لگاتا ہے اور ریٹائر ہونے والا ہے۔ کیا تم اس سے امید کرتے ہو کہ وہ انصاف کرتے ہوئے اپنے مذہب کو بھول جائے گا—؟ سونے پر سہاگا، تم اقلیت کے ایک کمزور اور دبو آدمی کو بھی جج کی کرسی پر بیٹھا دیتے ہو کہ وہ پچیس کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کے بارے میں غور کرتے ہوئے سچ بھول جائے اور ایک نکلے فیصلے پر اپنی منظوری کی مہر لگا دے—تم وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ ہائی کورٹ کے بعد اگر سپریم کورٹ کی باری آتی ہے تو ہمیں انصاف مل جائے گا؟'

تھاپڑ کی نظریں جھکی ہیں—

یہ صرف ایک فیصلہ نہیں تھا تھاپڑ—ہماری زندگیاں لگی ہیں داؤ پر—اٹھارہ برس کے بعد آیا یہ فیصلہ اگر سیاست کی نذر نہ ہوتا تو جانتے ہو کیا ہوتا—صرف یہ ایک فیصلہ آزادی کے بعد کے ہزاروں نکلے فیصلوں کے داغ دھو کر ہمیں مین اسٹریم میں لے آتا—علوی کے باپ اپنے بیٹے کے درد کو بھول جاتے۔ مجھے اسامہ کی گمشدگی میں بھی انصاف ملنے کی امید نظر آتی۔ گودھرہ سے مالیگاؤں اور بٹلہ ہاؤس تک کی نا انصافیوں کو ایک موہوم سی امید کی کرن مل جاتی۔ بار بار ہماری وفاداریوں کو چیلنج کرتے ہو تم—جبکہ ہماری وفاداریاں کھلی کتاب کی طرح روشن ہیں۔ لیکن تھاپڑ اب تمہاری وفاداری کو اس تاریخی فیصلہ کی آڑ میں ہم چیلنج کرنے آئے ہیں—جھوٹی ہیں تمہاری حکومتیں—مکار—ساری حکومتوں کے چہرے ایک ہیں'۔

میں ایک لمحے کے لیے ٹھہرتا ہوں—'آج ہم میں سے کوئی بھی اپنے بچوں کو سنہری ماضی کی کہانیاں نہیں سناتا۔ پدرم سلطان بود...... یہ ایک واہیات حقیقت تھی، جس کے پیچھے تباہ ہوتی ہوئی نسلوں کو دیکھا ہے ہم نے—آنکھیں کھلتے ہی ہم اپنے بچوں کو حقیقت کی پتھریلی زمین پر چلنا سکھاتے ہیں—مگر ہوتا کیا ہے۔ آنکھیں کھلتے ہی اسامہ جیسے بچوں کو ایک بٹلہ ہاؤس مل جاتا ہے—کہیں دنگے ہوتے ہیں تو وہ ڈر جاتے ہیں۔ اسکول میں دوستوں کے درمیان بھی ڈرے ڈرے ہوتے ہیں۔ ڈر کے یہ انجکشن ان کے جسم میں ہم بھی پیوستہ کرتے رہتے ہیں—اور اس لیے کرتے ہیں کہ حکومت سے میڈیا تک بار بار ہمیں ڈراری ہوتی ہے۔ ہم اخباروں میں مسلسل خوف و دہشت کی کہانیاں سنتے رہتے ہیں۔ چینلس پر دہشت گردوں کی یلغار دیکھتے ہوئے سہمے رہتے ہیں۔ اور یہ سب مسلمان ہوتے ہیں—دہشت کی ہر کارروائی کے پیچھے ایک مسلمان—ٹی وی دیکھتے، اخبار پڑھتے ہوئے ہمیں اپنے ہی مذہب اور اپنی قوم کے لوگوں سے نفرت ہونے لگتی ہے—پھر احساس ہوتا ہے کہ ارے اس کے پیچھے تو تم

تھے۔ یہ سب کچھ سوچی سمجھی کارروائیوں کا حصہ تھا— ہم سکون کی سانس لیتے ہیں۔ پھر کوئی دوسری مسلم دہشت پسند کارروائی سامنے آجاتی ہے— اور تم ہر بار ہمیں ان کارروائیوں سے ہمیں جوڑ دیتے ہو— ایک عام مسلمان کو— جو صبح آفس جاتا ہے اور رات گھر آتا ہے— ایک عام سیدھا سادا مسلمان جو تمہاری طرح اپنے وطن اپنے ملک سے اتنی ہی محبت کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے ملک میں اپنے لیے دیئے جانے والے انصاف کی امید بھی کرتا ہے— مگر کیا ملتا ہے اسے انصاف کے بدلے— ہر بار ایک دھوکہ۔'

'ابھی سپریم کورٹ کا دروازہ کھلا ہے.....' تھاپڑ کی کمزور آواز ابھری۔

' سارے ملک میں مسلمان جشن منا رہے ہیں۔ ٹی وی دیکھو۔ مٹھائیاں تقسیم جارہی ہیں۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ دنگے نہیں ہوئے۔ شانتی رہی۔ 92 نہیں دہرایا گیا— یہ مٹھائیاں نہیں تقسیم جارہی ہیں دوست۔ تم سے ایک حقیقت بتائی جارہی ہے کہ ہم ہر حال میں خوش ہیں۔ ہم دبے رہیں گے۔ ہمارے انصاف یہی رہیں گے۔ اور ہمارا کام مسکرانا ہوگا۔ جشن منانا ہوگا۔ مٹھائیاں تقسیم کرنا ہوگا۔ بات کسی قوم کی شکست اور فتح کی نہیں ہے۔ انصاف کے لیے حقائق ہوتے ہیں۔ دستاویز ہوتے ہیں۔ ثبوت ہوتے ہیں۔ مذہب کا آدرش یا مکھوٹا نہیں ہوتا— لیکن آدرش کا ایک مکھوٹا لگایا گیا— اور عدلیہ کی کرسی پر ایک بے زبان مسلم جج کو بیٹھا کر تاریخ کا اتنا بڑا فیصلہ لے لیا گیا— فیصلہ لینے والے جج نہیں تھے۔ دو الگ الگ مذہب کے لوگ تھے۔ اگر فیصلہ یہی تھا تو اس کے لیے اٹھارہ سال انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی— مذہب یا آدرش کی کسی بھی بوسیدہ کتاب سے یہ فیصلہ برسوں پہلے بھی سنایا جاسکتا تھا۔'

میں زور زور سے بول رہا تھا اور اب میرے منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی۔ تھاپڑ غور سے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں گم

ہیں—

'شاید تم ٹھیک کہتے ہو..... شاید پہلے میں بھی ایسا ہی سوچتا تھا۔ اور ہزاروں بار اس موضوع کو لے کر تم سے بات بھی ہوئی ہے۔ تم سے زیادہ میں ناراض ہوا کرتا تھا۔ ملک کے اس کرپٹ سسٹم پر۔ مگر ایک بات میں بھی بھول رہا تھا اور تم بھی......'

میں نے تھاپڑ کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا بولنا جاری رکھا—

' یہ آستھاؤں کا دیش ہے— پھر انصاف میں ان آستھاؤں کو تھوڑی سی جگہ کیوں نہیں مل سکتی ارشد پاشا— ؟ یہ فیصلہ آستھا بنام انصاف کے نام ہے۔ بہت کچھ بدلا ہے۔ جو صورتحال ۱۸ برس پہلے تھی وہ اب نہیں ہے— مگر آستھائیں موجود ہیں۔ اور آستھائیں اس ملک کی شانتی بھنگ ہونے سے روکتی ہیں تو غلط کیا ہے ارشد پاشا— اٹھارہ سال پہلے صرف مندر مسجد کا معاملہ تھا اور جوش سے بھرے دیوانے تھے— لیکن ان اٹھارہ برسوں میں دنیا کے ساتھ اپنا ملک بھی بدلا ہے۔ انڈیا شائننگ بھلے بھگوا پارٹی کا ایک باسی نعرہ بن کر رہ گیا ہو، جسے اچھالنے کے باوجود وہ اپنی قسمت نہیں چکا سکے— لیکن انڈیا شائن تو کررہا ہے۔ اور ایک بڑی طاقت، ایک بڑی حقیقت تو بن چکا ہے— اٹھارہ برس بعد خوشحالی کی ریس میں دوڑتے ہوئے نوجوان ہیں— جو جانتے ہیں مسجد مندر سے روٹی نہیں ملنے والی— کیریئر نہیں بننے والا۔ اس لیے اس بار فیصلے کو لے کر میڈیا کے ہنگامے کے باوجود عام آدمی خاموش رہا— اور سب سے بڑی بات کہ یہ فیصلہ کوئی آخری فیصلہ نہیں ہے—'

مجھے احساس ہوا، تھاپڑ، پہلی بار، مجھ سے نگاہیں بچانے کی کوشش کررہا ہے—

' تو یہ فیصلہ کہاں ہے تھاپڑ؟ سمجھوتہ ہے نا— آستھا کے نام پر ایک سمجھوتہ کیا گیا۔ اگر یہ فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوتا تو کیا سنگھ کے لوگ اسی طرح خاموشی اختیار کر لیتے؟ کیا وہ اس فیصلے کو منظور کرتے؟ کیا تب اس ملک کی شانتی بھنگ نہیں

'ہونہہ۔' تھاپڑ نے گہری سانس کھینچی۔

'یعنی تم بھی یہ تسلیم کرتے ہو کہ سنگھ خاموش نہیں رہتا۔ لیکن مسلمان خاموش رہ جائیں گے — کیونکہ مسلمان آزادی کے بعد کے ہر معاملے میں اب خاموش رہنا جان چکے ہیں۔'

'تمہاری آواز میں آزادی کے باسٹھ برسوں کی کڑواہٹ شامل ہے — '

'کیوں نہیں شامل ہونی چاہئے تھاپڑ؟ صرف اس لیے کہ ہر بار ہمیں اپنی ناکامیوں کے لیے بھی جشن کا انتظام کرنا پڑتا ہے — میں زور سے چلایا — میرا بیٹا غائب ہوا ہے۔ تمہاری اس جمہوریت میں۔ جہاں آستھاؤں کے نام پر کسی بھی فیصلے پر ہماری مہر نہیں لگتی — میں صرف اس لیے اس آستھا بنام انصاف کی حمایت نہیں کرسکتا کہ دنگے نہیں ہوئے — فیصلہ دنگے بھڑکانے والوں کے نام ہوا ہے۔'

'دنگے بھڑکانے والوں کے نام — ؟ تھاپڑ چونک کر بولا —

'تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ کل تک اس بات کا اعلان کررہے تھے کہ اگر فیصلہ ان کے حق میں نہیں آیا تو پرانی کہانی دہرائی جاسکتی ہے۔ یعنی اس جمہوریت کے قربان ہوجانے کے لیے صرف ہم بچتے ہیں — جسے آزادی کے بعد سے کھلونا دے کر بہلانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ لیکن کب تک بہلاؤ گے — ؟ ہم چین سے اور سکون سے رہتے ہیں تو تم ہلہ ہاؤس لے کر آجاتے ہو۔'

تھاپڑ نے مسکرانے کی کوشش کی —

ٹھیک یہی وقت تھا جب شمیمہ چائے کی ٹرے لے کر اندر آئی۔ اس کے ٹھیک پیچھے رباب تھی۔

'کیا باتیں چل رہی ہیں بھائی صاحب۔'

شمیمہ نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔ تھاپڑ غور سے شمیمہ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

'یہ میری بیٹی ہے۔'

رباب نے اپنے پاس ہی اسے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے نارمل ہونے کی کوشش کی — لیکن شاید اس لمحے ایسا کرنا میرے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ شمیمہ سہمی ہوئی تھی۔ رباب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

'چلیے۔ جو فیصلہ آیا ہے، اب اس کے بارے میں باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ ہم تو بس شانتی چاہتے ہیں بھائی صاحب۔ سب لوگ امن سے رہیں۔'

میں نے رباب کی طرف دیکھا۔ یقیناً اس کی آنکھوں میں دہشت اب بھی موجود تھی — اور شاید رباب کو اس بات سے تقویت ملی تھی کہ اب مجھے علوی کے خلاف بیان دینے کے حادثے سے نہیں گزرنا ہوگا — کیونکہ فیصلہ ان کی حمایت میں آیا ہے۔

تھاپڑ نے پھر مسکرانے کی کوشش کی — 'تب سے اس بیوقوف کو یہی تو سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں بھابھی۔ مگر آج تو جیسے کریلے کی سبزی کھا کر اٹھا ہے۔ آپ کریلا کیوں پکاتی ہیں بھابھی۔'

'ہمارے یہاں کوئی کریلا نہیں کھاتا۔' رباب نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا —

چائے ختم ہوچکی تھی۔ رباب، شمیمہ کو لے کر واپس اپنے کمرے میں لوٹ گئی —

میری سوئی اب بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے تھاپڑ کی طرف دیکھا۔ جانتے ہو تھاپڑ ہماری ناراضگی کی اصل وجہ کیا ہے؟ ہم نے ان فیصلوں میں اپنے بچوں کے لیے انصاف کی شکست دیکھی ہے۔'

ہے— ایک فیصلہ امن کی شرطوں پر— امن کی امید صرف ہم سے کی جاتی ہے؟

'ارے ہم تو پہلے ہی صدمے سے جھکے ہوئے ہیں۔ یہ درمیان کا کیسا راستہ ہے جہاں سب کو خوش کرنے کے لیے صرف ہمیں ہار کا تحفہ دے دیا جاتا ہے— کورٹ کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ سیتا رسوئی کہاں تھی اور بھگوان کہاں پیدا ہوئے— یہاں تو مذہبی کہانی ہی گواہ بن گئی— شاید دنیا میں ایسا پہلی بار ہوا۔ جب یقین اور آستھا نے ایک اہم تاریخی فیصلہ سنانے میں مدد کی ہو— اور ان کٹر وادیوں کے لیے اشارہ بس اتنا ہے کہ ہم ہار چکے ہیں— اگر کل کاشی اور متھرا کی باری آتی ہے تو ہم پہلے سے ہی اپنی ہار تسلیم کر لیتے ہیں۔'

'دنیا اب بدل چکی ہے—' تھاپڑ اب بھی مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'اس لیے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آنے والے وقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آنے والے وقت میں ہم مندر مسجد معاملوں سے آگے نکل چکے ہوں گے۔'

'شاید۔ لیکن تب بھی ہلہ ہاؤس ہوتے رہیں گے— میں نے ہنسنے کی ایک ناکام کوشش کی—

فضا بوجھل ہو چکی تھی۔ اب اس فضا کو مزید بوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر جانے کیوں، آج تھاپڑ مجھے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ یہ وہ تھاپڑ نہیں تھا۔ سسٹم کے بھوت کو گالیاں دینے والا تھاپڑ۔ مجھ سے کہیں زیادہ غصہ کرنے والا تھاپڑ۔ اور یقیناً میرے لیے یہ نئی اور حیران کرنے والی بات تھی۔

مگر شاید حیران کرنے والی بات اب سامنے آنے والی تھی—

تھاپڑ نے اچانک دھماکہ کیا تھا—

'مطلب؟'

'گم کا مطلب نہیں جانتے کیا......؟'

'ہاں جانتا ہوں۔ مگر گم ہونا......'

'میں اچانک گم ہو جاؤں گا تمہارے درمیان سے۔ مگر میں چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے ہم ایک بار ضرور ملیں۔'

'میں سمجھا نہیں۔ پہیلیاں مت بجھاؤ۔ کیا تم کاشی واپس لوٹ رہے ہو؟۔'

'نہیں'

'لکھنؤ؟'

'نہیں'

'تو پھر یہ گم ہونا؟ کیا گھر والے بھی......؟'

'ارے جہاں میں رہوں گا۔ وہیں تو گھر والے رہیں گے۔'

تھاپڑ نے ہنسنے کی کوشش کی—

'مگر کہاں گم ہو جاؤ گے۔'

'یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔ لیکن کل تمہیں کہیں لے جانا چاہتا ہوں۔'

'کہاں؟ کس جگہ؟ اور کیوں؟'

'کتنے سوالات ہیں تمہارے اندر۔ شاید انہی سوالات کو تمہارے اندر سے نکالنے۔ یا ان میں سے بہت سارے سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لیے......'

تھاپڑ نے فلسفیانہ انداز میں کہنا شروع کیا— دراصل کبھی کبھی ہم وہ نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں۔ جیسے یہ کائنات بھی مجھے کسی بلیک ہول کا ایک حصہ لگتی ہے— ایک زندگی، تلاش کے نام پر ختم ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ آستھاؤں اور بھگوان کی

تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے دراصل......

تھاپڑ کہتے کہتے رکا۔ 'ہم وہ نہیں ہوتے جو اصل میں ہوتے ہیں۔ تمہارا ابھی کا چہرہ وہ نہیں تھا۔ جو تم اصل میں ہو۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہم میں ایک وقت میں کئی چہرے ہوتے ہیں — ملٹی پل ڈس آرڈر۔ یہ کچھ اور ہے — ایک چہرے کو بنانے اور سنوارنے میں ہم کئی برس لگا دیتے ہیں۔ تب ایک بنیاد بنتی ہے۔ ایک یقین کی عمارت تیار ہوتی ہے۔ شاید ایک آئیڈیالوجی بنتی ہے —'

میں غور سے تھاپڑ کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا —

تھاپڑ مسکرایا۔

'اس لیے گم ہونے سے پہلے آخری بار تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تم پر منحصر ہے کہ تم ملنا چاہو گے یا نہیں — ممکن ہوا تو ملاقات کے راستہ آگے بھی کھلیں گے اور یہ ممکن ہے کہ یہ راستے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔'

'پہیلیاں......' مجھے غصہ آ رہا تھا۔

'نہیں اس میں کوئی پہیلی یا معمہ نہیں ہے میرے دوست — یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر لیا ہے کہ تم کو وہاں لے جانا چاہیے یا نہیں — میرے دل نے کہا۔ نہیں لے جانا چاہیے — شاید بدلتی ہوئی اس دنیا میں تم اپنے نظریہ کو ایک نیا موڑ دینے کے لیے تیار ہو سکو۔ جس کی امید مجھے کم لگتی ہے — مگر میں نے امید نہیں ہاری ہے —'

'تھاپڑ۔ آج تمہاری کوئی بھی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہیں نہ کہیں اس فیصلے نے تمہیں بھی متاثر کیا ہے۔'

'پتہ نہیں۔ تھاپڑ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر تمہارا شکریہ دوست۔ تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ بلکہ قدم قدم پر۔ اور سچ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو تلاش کر رہے

ہے اور میں تمہیں سمجھنا چاہتا تھا۔'

'سمجھ پائے؟'

'تھوڑا تھوڑا — یا تم سے کہیں زیادہ تم کو سمجھ پانے کی کوشش کی۔'

اس بار اس نے زور سے ٹھہاکا لگایا تھا —

اس نے اٹھنے کی کوشش کی —

'اب چلوں گا دوست۔'

'مگر خدا کے واسطے یہ تو بتا دو کہ چلنا کہاں ہے۔'

'وہ تمہیں پتہ چل جائے گا۔ ٹھیک دو بجے۔ وقت یاد رہے گا نا...... میں تمہارے پاس آ جاؤں گا۔'

'تم مجھے الجھن میں ڈال رہے ہو۔'

'زندگی ہی الجھن ہے۔'

'اور گم ہونا......؟'

'نجات میں داخل ہونے کی کارروائی۔'

'یہ تو مذہب کو ماننا ہوا۔ تم مذہب کو کب سے ماننے لگے؟'

تھاپڑ ہنسا — تم ہی تو کہتے تھے، ہم میں سے ہر آدمی کے اندر کہیں نہ کہیں ایک سویا ہوا مذہب موجود رہتا ہے۔'

'تو کیا میں یہ سمجھوں کہ یہ مذہب جاگ گیا ہے۔'

'ہونہہ'

'یہ تبدیلی فیصلے سے پہلے آئی یا بعد میں؟'

'اس تبدیلی میں اس فیصلے کا کوئی دخل نہیں —' تھاپڑ زور سے مسکرایا —

'تو یہ مذہب تمہارے اندر پہلے سے ہی موجود تھا اور تم مجھ سے چھپا رہے

’جرنلسٹ مت بنو۔ اردو کے ہی صحافی رہو تو بہتر ہے۔ سب کچھ آج جان لوگے تو کل کیا کروگے ارشد پاشا۔‘

’ کل......؟

’ ارے دو بجے۔ بھول گئے کیا— ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔ بس کل میرے ساتھ چلنا۔ اور اس سے زیادہ سوچنے کی ابھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔‘

●●

تھاپڑ جا چکا ہے۔ لیکن مجھے پہیلیوں کی دنیا میں چھوڑ گیا ہے۔ یہ ماننے کو دل نہیں چاہتا کہ تھاپڑ کے اندر کہیں سویا ہوا ایک مذہب بھی رہ سکتا ہے۔ تھاپڑ کی اب تک کی زندگی مجھے ایک معمہ کی طرح لگنے لگی— آج کی طرح بدلا بدلا وہ مجھے کبھی نظر نہیں آیا—

لیکن الجھن یا پہیلی سے زیادہ وہ مجھے دہشت میں مبتلا کر گیا ہے— اس نے میرا شکریہ کیوں ادا کیا؟ وہ کہنا کیا چاہتا تھا؟

کھل جا سم سم......

لیکن اس طلسم کی چابی ابھی میرے پاس نہیں تھی اور اس کے لیے مجھے آنے والے کل کا انتظار کرنا تھا—

تھاپڑ کے جاتے ہی رباب آ گئی تھی۔

’ بھائی صاحب آج کچھ بدلے ہوئے نہیں لگے؟ ‘

’ ہاں ‘

’ سب کچھ بدل گیا ہے۔ ‘

زیادہ مت سوچو۔ دیکھو میں نے کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ پڑھو نا......

رباب نے ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ میں نے پیار سے مسکراتے ہوئے کاغذ اس کے ہاتھوں سے لے لیا— رباب کی یہ ادا مجھے پسند ہے۔ جب وہ گھبراتی ہے یا پریشان ہوتی ہے تو اسے نظم یا کہانی کی صورت میں لکھ لیتی ہے۔ شاید ایسا کرتے ہوئے وہ اندر کے سارے غبار نکال کر خود کو ہلکا کر دیتی ہے۔ اور یہی میں نہیں کر پاتا۔

میری آنکھیں نظم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آج اس نظم میں اس کا لہجہ مختلف تھا—

’ نہیں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔
نہیں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔
تیزی سے بدلنے کے عمل کو۔
آپ، نیوٹن کا، سائنس کا فارمولا نہیں کہہ سکتے
نہیں کہہ سکتے
گھبرایئے مت
کہنے اور نہیں کہہ سکنے کے درمیان
کھڑی ہے ایک مخدوش عمارت سیاست کی
ایک جلتا ہوا شطرنج ہے۔
آگ میں جھلتے مہرے
اور ان کے شامل ہے
ایک جلتا ہوا فیصلہ

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے

سب کچھ اچھا ہے
یا سب کچھ اچھا نہیں ہے

جب آپ بچانا چاہتے ہوں
مہروں کو، اور پیادوں کو
جلتی ہوئی شطرنج سے
فی الحال سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے
فی الحال سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے"

میری آنکھیں ان الفاظ میں ڈوب گئی ہیں۔ جیسے رباب نے خاموشی سے اس وقت کی کیفیت کو لفظوں کا لباس پہنا دیا ہو——
اس لمحہ میرے لیے وہ اپنے قد سے اور بڑی ہو گئی ہے——

(۲)

تھاڑ کے جانے کے بعد رباب، شمیمہ کے ساتھ کیرم بورڈ نکال کر بیٹھ گئی۔ میں شمیمہ میں تیزی سے نئی اور خوشگوار تبدیلی کے آثار دیکھ رہا تھا۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ نئی زندگی اسے پسند آنے لگی تھی۔ ہاں، مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ابھی بھی اسے گھبراہٹ سی ہوتی تھی۔ لیکن میری نفسیات بھلا وہ کیا سمجھتی۔ میں جب بھی اسے دیکھتا،

میں شمیمہ کی طرف [illegible] یا اس سے باتیں کروں۔

'وہ تم سے ڈرتی ہے......رباب نے بتایا تھا۔

'اس سے کہو......بس کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا......'

اسی درمیان دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے اکبری مسجد کے امام صاحب کا بیٹا صفدر کھڑا تھا۔ گھبرایا ہوا۔

'کیا بات ہے صفدر......؟

'غضب ہو گیا۔ علوی کے ابو کا انتقال ہو گیا۔ ہارٹ اٹیک'

'کب؟'

'کچھ دیر پہلے۔ سارا محلہ جمع ہے۔'

'چلو میں آتا ہوں'

میں کسی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو چکا ہوں۔ جسم بے حرکت...... آنکھیں بجھی ہوئی۔ آنکھوں میں بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی تصویر ایک بار پھر روشن ہو گئی...... علوی کے ابو کا معصوم سا نورانی چہرہ۔ وہ اس تاریخی فیصلے کو برداشت نہیں کر پائے——

قدموں میں لرزش تھی۔ رباب مجھے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

'ٹھہر جایئے۔ میں بھی چلتی ہوں۔

آنکھوں کے آگے جھلملاتے اندھیرے کا رقص ہے۔ اس لیے مجھے اپنی دنیا کہیں کھوئی لگتی ہے۔

●●

رات کے آٹھ بجے کا وقت۔ گاڑیوں کے ہارن کی تیز آوازیں۔ رکشے والے اور ٹیمپو والوں کے شور۔ تاریخی فیصلے کا شور علوی کے ابو مرنے کے شور میں کہیں گم ہو گیا

دیکھتے کالونی کے باہر بھیڑ لگ گئی۔ اور اس بھیڑ [illegible] میں غلط بیانیاں [illegible] لوگ بیحد غصے میں تھے۔ حکومت کو گالیاں دی جارہی تھیں۔ بالائی منزل اور سیڑھیوں سے ٹھہر ٹھہر کر رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ لوگ اب بھی چیخ رہے تھے——

'فیصلہ کھا گیا علوی کے ابو کو'

'ارے بالکل ٹھیک تھے۔ فیصلے کے آنے تک بالکل ٹھیک تھے۔ کہتے تھے فیصلہ حق میں آیا تو علوی کے حق میں بھی فیصلہ آجائے گا۔ پھر ہم علوی کو گھر لے آئیں گے......'

'پھر......'

'ساڑھے تین بجے فیصلہ آیا۔ ۴ بجے سینے کے پاس تکلیف کی شکایت کی۔ لیٹ گئے۔ گھر والوں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا تو منع کر دیا۔ اور چھ بجے دل کا سخت دورہ پڑا۔'

'رہی سہی امید بھی دم توڑ گئی تو زندگی کہاں سے ملتی۔'

'اور دیکھو تو مرے بھی تو کس دن...... فیصلے کے دن۔ جیسے جاتے جاتے اپنا آخری پیغام دے گئے ہوں کہ فیصلہ نامنظور۔'

بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ امام صاحب، ڈاکٹر اجمل، راشد کے ابو، انجینئر صاحب عبدالمتین، زاہد صاحب، عمر شیخ، دوا کی دکان والے ڈاکٹر، علوی کے دوست اور رشتہ دار——

لوگ آنسو بہار ہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔

دیکھا۔ مسلمانوں کو بھونا دلاسہ دیا۔ اور سکھ کے لوگوں کو خوش کر دیا۔'

ارے کمی ہم میں ہی ہے۔ ہم اینٹ سے اینٹ بجادیں تو مجال ہے کہ ہماری آواز دب جائے۔'

' بس مسلمانوں کو مشورہ کہ ہم خاموش رہیں۔ ہم خاموش کیوں رہیں صاحب——'

' صاحب۔ بٹلہ ہاؤس کے معاملے کو پھر سے اٹھانے کی ضرورت ہے—— علوی جیل میں ہے اور انصاف کی امید کرتے کرتے علوی کے ابو دنیا سے کوچ کر گئے۔'

' ہم ہر بار دب جاتے ہیں۔ اس بار نہیں۔ اس بار ہم خاموش نہیں رہیں گے۔'

'تو جایئے۔ چیخئے۔ چلایئے——' یہ امام صاحب تھے جو غصے میں چلتے ہوئے ان لوگوں کے پاس آگئے تھے۔

'جایئے۔ ہنگامہ کیجئے۔ یہی تو وہ چاہتے ہیں——اور آپ کے ہنگاموں کو بابری مسجد فیصلے کی مخالفت کے طور پر لیا جائے گا۔ یعنی عدالت کا فیصلہ آپ کو منظور نہیں——اور اس کے بعد کیا ہوگا جانتے ہیں۔ جانتے ہیں آپ لوگ......؟'

امام صاحب زور زور سے بول رہے تھے—— 'پہلے ایک بٹلہ ہاؤس ہوا تھا۔ وہ ہزاروں بٹلہ ہاؤس پیدا کر دیں گے۔ آپ، ہمیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دہشت گرد بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیں گے۔ طاقت ہے آپ میں اپنے دفاع کی—— طاقت ہوتی تو پھر انکاؤنٹر کرنے والوں کو سرکاری تمغہ نہیں ملتا—— طاقت ہوتی تو حکومت اکھڑ گئی ہوتی—— بات مت بڑھایئے۔ سکون کی زندگی جینے دیجئے۔'

' سکون کہاں ہے امام صاحب......' راشد کے ابو پوچھ رہے تھے—— میرے بیٹے کو ماردیا ظالموں نے۔ مجھے گھٹ گھٹ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ قصور بتائے گی

[illegible] حکومت کہ میرے بیٹے کا قصور کیا تھا— قصور تھا کہ جوان ہونا— قصور تھا مسلمان ہونا— قصور تھا کہ وہ اپنا کیریئر بنانا چاہتا تھا— بڑا بننا چاہتا تھا— [illegible] نے۔ ٹیررسٹ بنادیا— ناراض مت ہوئیے امام صاحب ان لوگوں پر۔ یہ سب دکھی ہیں۔ علوی کے ابو تو چلے گئے۔ ہم کون سا زندہ ہیں؟ اور یہ کوئی زندگی ہے امام صاحب— ڈر ڈر کے جی رہے ہیں ہم اور آپ— ایک ہی خوف کہ پھر کوئی بٹلہ ہاؤس سامنے نہ آجائے۔ لیکن کب تک ڈریں گے— کچھ تو کریں گے آپ؟ کوئی تو مورچہ لے گا۔ اس طرح تو حکومت اور سازشی جماعتیں مسلمانوں کا استعمال کرتی جائیں گی۔ کہیں تو کوئی آواز بلند ہوگی—؟'

'ٹھیک کہتے ہیں آپ—' ڈاکٹر اجمل سخت غصے میں نظر آرہے تھے— 'ہماری زندگیاں بھی جائیں اور ہم اف بھی نہ کریں۔ صرف اس لیے مرغی کے دربے میں بند ہوجائیں کہ ہمیں دہشت گرد نہ کہہ دیا جائے— صرف اس لیے کہ ہم داڑھی رکھتے ہیں اور ٹوپی پہنتے ہیں۔ موت سے بدتر لگنے لگی ہے یہ زندگی۔'

ڈاکٹر اجمل چیخ کر بولے— سہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد صرف سہتے ہی تو آئے ہیں مسلمان۔ ۱۸ سال ایک فیصلے کے انتظار کے بعد دھوکہ ملتا ہے۔ اس ملک سے کس انصاف کی امید رکھی جائے— کوئی بولنے والا ہے ہمارے لیے—؟ اردو اخبار لکھ لکھ کر، چیخ چیخ کر ہار گئے۔ حکومت کے کان میں جوں نہیں رینگی—؟ نہیں نا۔ حکومت جانتی ہے کہ لکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ حکومت بھی انہی کی ہے۔ اور انہی کے تلوے چاٹتی ہے۔ اور ہم سب جھوٹی امید کی دنیا میں رہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں......'

'آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اور میں آپ لوگوں کے جذبات سمجھ رہا ہوں۔'

'لیجئے میر صاحب بھی آگئے۔'

[illegible]

[illegible] ہوئے کہا—

'میری مانیے— اور اگر اسے سیاست سے نہ جوڑیے تو میں ایک بات کہنے کی اجازت چاہوں گا۔'

'کہیے۔' امام صاحب کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

'میں پھر کہوں گا۔ میری تجویز کو سیاست نہ سمجھا جائے— جیسا کہ ہمارے بھائیوں کا خیال ہے، ان دنوں ہمارے ساتھ سخت ناانصافیاں ہوئی ہیں۔ آج ہی تاریخی فیصلہ آیا اور آج ہی علوی کے ابو اس فیصلے کی تاب نہ لا کر جام شہادت پی گئے— جی ہاں۔ جام شہادت— اس فیصلے کی مخالفت ضروری ہے۔ اس مسلم مخالف فیصلے نے ہمارے دل توڑ دیے اور بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی یادیں تازہ کر دیں۔'

'آپ کیا کہنا چاہتے ہیں—' امام صاحب کو یہ سیاست راس نہیں آرہی تھی۔

'میر صاحب کو کہنے تو دیجئے۔'

'ہاں میر صاحب اپنی بات پوری کیجئے۔'

'ہم سننا چاہتے ہیں کہ آخر آپ کے دل میں کیا ہے—؟'

'اور آپ کی تجویز کیا ہے۔'

میر صاحب کے حمایتی اچھی خاصی تعداد میں جمع ہوگئے تھے—

میر صاحب نے آسمان کی طرف دیکھا— پھر گویا ہوئے—

'علوی کے ابو کی موت رائیگاں نہیں جائے گی۔ کیوں نہ ہم ایک تیر سے دو شکار کریں۔'

'ایک تیر سے دو شکار، وہ کیسے—؟ ڈاکٹر اجمل نے پوچھا۔

مخالفت کا اعلان کر دیں——دوسری طرف بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے [illegible] احتجاج [illegible] زخم
نہ بھرے ہیں۔ نہ بھریں گے۔'

'لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟'

' کیا آپ پریس کو بلائیں گے؟'

' چینلس والوں کو......؟'

' کیسے کریں گے احتجاج——؟'

' میں اپنی تجویز رکھتا ہوں۔ سوچنا اور ماننا آپ کا کام ہے۔'

میر صاحب آہستہ سے بولے۔

'تو پھر اپنی تجویز ہمارے سامنے رکھیے——، امام صاحب نے کہا۔

'ہاں ہم سننا چاہیں گے——ڈاکٹر اجمل بولے۔

'تو سنیے——ہم علوی کے ابو کے جنازے کو بطور احتجاج سڑک کے چوراہے پر رکھ دیں گے۔ نماز جنازہ وہیں ادا کی جائے گی۔'

' مطلب؟' امام صاحب زور سے چیخے——

' نمبر ایک۔ وہ بھیڑ بھاڑ والا چوراہا ہے۔ ٹریفک جام ہو جائے گا۔ پریس اور چینلس کے لوگوں کو وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ حکومت تک اپنا غصہ اپنا احتجاج پہنچانے کا یہ بھی ایک راستہ ہے۔ مگر یہ تب ممکن ہے، جب آپ لوگ اس تجویز پر غور کریں۔'

' لیکن جنازہ چوک پر کب تک رکھا جائے گا——؟'

' جب تک حکومت نہ جاگ جائے۔'

' لاش بدبو دینے لگے گی۔'

ہزاروں لاکھوں لوگ ہوں گے۔'

'پھر تجہیز و تکفین؟'

' انشاء اللہ کل ظہر کی نماز کے بعد۔ اتنی دیر میں حکومت اور ساری دنیا تک ہمارا پیغام اور احتجاج پہنچ چکا ہوگا۔'

میر صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

شور غل میں اضافہ ہو چکا تھا——اتنی دیر میں میر صاحب کی چھوڑی ہوئی آتش بازی اپنا کام کر چکی تھی——

' مسلمانوں کو کسی نہ کسی صورت میں اپنا احتجاج حکومت تک پہنچانا ہی چاہئے۔ کیوں بھائی۔'

'میر صاحب کی بات میں وزن ہے۔ دو سال ہو گئے لیکن ہم میں سے کوئی بھی بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کو نہیں بھول سکا۔'

' قوم کے لیڈر ہمارے کام نہیں آئیں گے۔ میڈیا کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ اگر میڈیا کا ساتھ مل جاتا ہے تو یقیناً ہم اپنا غصہ بخوبی درج کرانے میں کامیاب ہوں گے۔'

' پولس؟ لاء اینڈ آرڈر؟' بھیڑ میں کسی نے سوال کیا۔

' کچھ موقع آتے ہیں جب لاء اینڈ آرڈر کو توڑنا پڑتا ہے۔ ایک رسک لینا پڑتا ہے۔'

امام صاحب خاموش تھے۔

'کیا علوی کے رشتہ دار اس کے لیے تیار ہو جائیں گے؟'

'علوی جیل میں ہے — بے قصور — اور قاتل [illegible] بھی علوی کو آخری بار باپ کو دیکھنے کی اجازت نہیں ملی —'

اس بات پر لوگوں کا غصہ دوبارہ پھوٹ پڑا —

'اجازت کیوں نہیں ملی —'

'کیونکہ علوی کا معاملہ دوسرے کریمنل معاملات سے مختلف ہے۔'

'ہم جیل کی دیواریں توڑ دیں گے۔'

'ہم ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔ یہ ایک خاموش احتجاج ہوگا۔'

میر صاحب نے دوبارہ اس بحث میں حصہ لیا۔

'اس بار انشاء اللہ سب ٹھیک رہا تو حکومت کو جھکنے پر مجبور کر دیں گے۔ اب اور ہلہ ہاؤس نہیں۔'

'نعرۂ تکبیر اللہ اکبر۔'

کسی نے زور سے آواز لگائی۔

'اللہ اکبر۔'

ایک ساتھ بہت ساری آوازیں بلند ہوئیں۔

سیڑھیوں سے تیزی سے بھاگتی ہوئی رباب نیچے آئی۔ اس کی آنکھیں بھیڑ میں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے اسے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

رباب خوفزدہ تھی۔ 'یہ سب کیا ہو رہا ہے —؟'

'سیاست گرما گئی ہے......'

'لاش کو لے کر......؟'

نہیں کہہ سکتا۔

'یہ کون سا وقت ہے مرے ہوئے کی سیاست کرنے کا —؟'

میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

'مٹی منزل کب ہوگی؟'

'نہیں جانتا۔'

بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ ٹریفک کے شور بڑھ گئے تھے۔ اب مختلف گروپ بن گئے تھے۔ میر صاحب، امام صاحب اور راشد کے ابو الگ الگ اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے۔

رباب خوفزدہ تھی۔

'مجھے یہاں ڈر لگ رہا ہے۔ شمیمہ اکیلی ہے۔ تم بھی گھر چلو۔'

'تم جاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔ ابھی جانا مناسب نہیں۔'

'پھر میں بھی ابھی ہوں۔'

رباب نے چاروں طرف دیکھا پھر پھسپھسا کر بولی۔ کیا ایسے موقع پر سیاست ضروری ہے —؟'

'ابھی اسکا جواب میرے پاس نہیں۔'

'انہیں کس کا انتظار ہو رہا ہے۔'

'مرحوم کے بھائی اور ماموں آنے والے ہیں۔ ان سے مشورے کے بعد ہی تجویز کو عملی شکل دی جائے گی۔'

●●

میر صاحب کے خیمے کے لوگ جوش میں تھے —

'آپ کی بات میں وزن ہے۔'

حق میں اچھا کیا ہوا—؟ ہماری اپنی ایک آواز نہیں۔

’ میر صاحب آگے بڑھیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔‘

’ اللہ اکبر۔‘

’ نعرۂ تکبیر۔‘

میر صاحب نے ہاتھوں سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

’ میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں۔ اور میں نہیں سمجھوں گا تو کون سمجھے گا، آپ کے جذبات—اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ دو سال قبل آپ لوگوں پر کیا گزری۔ اور آج کے دن حکومت نے نفرت کی ایک اور کیل ہمارے سینے میں ٹھوک دی۔ یہ کون بتائے گا انہیں کہ ہمارے زخم اب رسنے لگے ہیں۔ سہے نہیں جاتے۔ برداشت سے باہر ہوگئے ہیں—ہم ساری دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ اور یہاں اپنے ہی ملک میں آزادی کے بعد کی یہ ذلت اب برداشت کے باہر ہوچکی ہے۔ اور یہ سب اس لیے ہے کہ حکومت تک ہماری آواز پہنچانے والا کوئی نہیں۔ حکومت ہمیں گونگا اور مردہ سمجھتی ہے۔ اس لیے ہمیں اذیت پہنچانے اور مارنے کے حیلے بہانے تلاش کرتی ہے۔‘

’بجا فرمایا۔‘

’ میر صاحب۔ زندہ باد۔‘

’ مسلمانوں کے قائد۔ میر صاحب۔ زندہ باد۔‘

اللہ اکبر......

نعرۂ تکبیر۔ اللہ اکبر......

’ سبحان اللہ۔‘

بھیڑ سے پھر ایک نیا نعرہ اچھلا—

’ میر صاحب آگے بڑھیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔‘

میر صاحب نے مسکراتے ہوئے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

’یہ وقت ہوش کھونے کا نہیں۔ ہوش میں رہتے ہوئے سمجھداری سے اپنے مہرے چلنے کا وقت ہے۔ سیاست کی بساط بچھ چکی ہے—تو ہم کیوں خاموش رہیں؟ کیوں مارے جائیں؟ کیوں ان کے ظلم وستم کو اپنا مقدر مان لیں؟ آواز کیوں نہ بلند کریں۔ احتجاج کیوں نہ کریں۔ اور یہ بہتر وقت ہے اپنی آواز ان لوگوں تک پہنچانے کے لیے......‘

راشد کے ابو بھی اس وقت بہت سارے لوگوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ان کی آواز بوجھل اور کمزور تھی۔

’اس حقیقت سے وہی واقف ہے جس نے خود اس صدمے کو جھیلا ہے۔‘

’ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔‘

’ میری آنکھوں کے سامنے میرا بیٹا مارا گیا۔ گولیاں چلیں۔ میری آنکھوں کے سامنے۔ میں نے اپنے پھول جیسے معصوم بچے کو آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا ہے—اس پر بھی ظالموں نے بس نہیں کیا—میرے بچے کو دہشت گرد بنا دیا—میں اپنے بچے کی موت پر دو آنسو بھی نہیں بہا سکا۔ اہلیہ اور گھر والوں کو دلاسہ کیا دیتا۔‘

ہم میں سے زندہ کون تھا—اور اب کون زندہ ہے......‘

’ صحیح فرمایا۔‘

الحمدللہ۔ ان کا خون خون، مسلمانوں کا خون پانی۔‘

’اس لیے......راشد کے ابو کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے—’میں نے

کے ابو فیصلے میں ہوئی ناانصافی کی تاب نہ لا کر انتقال کر چکے ہیں — کیا ہم سب اسی طرح ہارے جائیں گے — کیا مسلمانوں کے لیے اب اسی طرح گھٹ گھٹ کر مرنا ہی مقدر رہ گیا ہے۔'

' بالکل بھی نہیں۔'

' آپ سچ کہتے ہیں۔'

' ان کی حقیقت اب سب کے سامنے آچکی ہے۔'

' تو پھر ہم حقیقت کو کب سمجھیں گے؟ جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا؟ اب کتنا اونچا ہوگا پانی۔ اس لیے۔ میر صاحب سچ کہتے ہیں۔ ہمیں میر صاحب کی بات مان لینی چاہیے۔'

' اللہ اکبر......

نعرۂ تکبیر —

امام صاحب اپنی کمزور آواز میں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے میر صاحب کی باتوں میں نہیں آیئے۔ وہ سیاست داں ہیں۔ ساری زندگی ناکام سیاست کرتے رہے۔ سیاست میں کچھ نہیں ملا تو اب مسلمانوں کی سیاست پر اتر آئے ہیں۔ میری بات مانیے۔ لاشوں کی سیاست مت ہونے دیجیے۔

لوگ خاموش تھے۔

' زمانہ برا ہے۔ مسلمانوں پر بہت برا وقت آیا ہے۔ صبر سے کام لیجیے۔'

' کب تک صبر کریں امام صاحب۔ صبر کی تو انتہا ہو چکی ہے۔'

' اور میر صاحب نے غلط کیا کہا؟'

کچھ لوگ اما صاحب کی طرفداری کر رہے تھے —

امام صاحب ٹھیک کہتے ہیں

' یہ وقت سیاست کا نہیں ہے'

' اس سیاست کو بابری مسجد فیصلے کی نامنظوری کے طور پر دیکھا جائے گا۔'

' ابھی امن ہے۔ لوگ ہمیں امن مخالف سمجھیں گے۔'

' دنگے بھی بھڑک سکتے ہیں۔'

ایک نوجوان غصے میں سامنے آیا — بھڑک نے دیجیے۔ لیکن کل پولس والے ہمارا فرضی انکاؤنٹر تو نہیں کریں گے۔ انکاؤنٹر سے پہلے انہیں دس بار سوچنا ہوگا۔'

' امام صاحب ہمیں سمجھایئے مت۔ سمجھانا ہے تو حکومت کو سمجھایئے۔ انہیں سمجھایئے جو بھید بھاؤ کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کو سمجھایئے جو بلڈ ہاؤس کے، امن کے دشمن بن جاتے ہیں۔'

امام صاحب کی آواز کمزور تھی — میرا کام کہنا تھا۔ آگے آپ کی مرضی۔ آپ جانیں۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔' وہ کمزور قدموں سے آگے بڑھ گئے۔

دس بجے تک علوی کے ابو کے رشتے دار آگئے۔ کچھ لوگ علی گڑھ اور میرٹھ سے آئے تھے۔ کچھ ریلوے سے اور کچھ بس پکڑ کر۔ ابھی تک یہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس کی اطلاع یا بھنک پولس کو نہیں ہوئی تھی — دس بجے تک ٹریفک بہت حد تک کم ہو گیا — آس پاس کے بہت سے دکاندار بھی دکان بند کر کے جنازے میں شریک ہونے کی غرض سے آگئے تھے۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔

ساڑھے دس بج گئے تھے۔

میر صاحب علوی کے ابو کے رشتہ داروں سے گفتگو کرتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے آگئے۔ یہ چار لوگ تھے — بزرگ ہستیاں۔ کرتے پائجامہ میں — یہ لوگ میر

صاحب کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔

'بہت ممکن ہے، اس سے علوی کو باہر لانے میں مدد ملے۔'

'ہونہہ'

'اور یہ فیصلہ آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے۔ کیا آپ چاہیں گے کہ علوی زندگی بھر جیل میں سڑتا رہے — کیا آپ علوی کے ابو کی خواہش کا احترام نہیں کریں گے۔ جو علوی کو جیل سے واپس لانا چاہتے تھے۔ جو چاہتے تھے کہ علوی کے کیریئر پر لگا ہوا داغ دھل جائے۔ کس کے بھروسے ہیں آپ لوگ؟ ایسے تو وہ لوگ علوی کو جیل میں مار ڈالیں گے — اور جیل کی زندگی تو مردوں سے بدتر ہے — بس یہی ایک راستہ ہے۔ لیکن یہ راستہ آپ لوگوں کی حمایت پر منحصر ہے۔ آپ ساتھ دیتے ہیں تو علوی کے لیے ایک امید جاگتی ہے۔ نہیں دیتے تو علوی کی رہائی کا آخری راستہ بھی بند۔'

'آپ بجا فرماتے ہیں۔'

'انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔'

'ایک بہتر سوچ علوی کو واپس لانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔'

میر صاحب نے سرگوشیوں میں کہا — لیکن یہ کام ہمیں خاموشی سے اور بغیر شور مچائے انجام دینا ہوگا — اور اس لیے بہتر ہے کہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے آپ لوگ میرے گھر چلیں — اس طرح بھیڑ لگانے سے یہ بات فوراً پولس کی نوٹس میں آسکتی ہے کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔ اس لیے جو لوگ ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیں وہ ہمارے غریب خانے پر چلیں۔'

'آپ کو ہم سب کا تعاون ملے گا۔'

'میر صاحب زندہ باد۔'

علوی کے ابو کے خاندان والوں کی رضامندی ملتے ہی میر صاحب اور ان کے رفقاء میں جوش آ گیا۔ نوجوان بھی میر صاحب کے ساتھ تھے۔ اس لیے کہ مسلسل خوف ودہشت کی فضا میں جیتے ہوئے وہ اس پرآشوب موسم سے باہر آنا چاہتے تھے۔

کچھ ہی دیر میں یہ قافلہ میر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا —

رات کے ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔

میر صاحب کے گھر کے اس بڑے سے ہال میں اس وقت ساٹھ سے ستر لوگ آندھی طوفان کی طرح جمع ہوگئے تھے۔ اور اسی کے ساتھ مین گیٹ کو بند کر دیا گیا — میر صاحب کے دماغ نے احتجاج کے تمام پہلوؤں کو سوچ رکھا تھا۔ انہوں نے نوجوانوں کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ پھر کہا — 'فرحان۔ مونس، ذیشان، آپ لوگ بینر تیار کریں گے —

وہاں میز سے قلم اور کاپی اٹھائیے۔ اور بینر بنانے کی تیاری کیجیے — بینر میں کیا لکھا ہوگا۔ یہ میں بتاتا ہوں۔ فرحان، مونس اور ذیشان کی عمر بیس سے پچیس کے درمیان ہوگی۔ یہ لڑکے شان سے آگے بڑھے۔ میز سے قلم اور کاپی سنبھال لی۔ میر صاحب سوچتے ہوئے بولے — کچھ عنوانات اس طرح ہوں گے۔ اور یہ عنوانات اردو ہندی اور انگریزی تینوں زبان میں لکھے جائیں گے۔ بینر ایسے ہوں گے جو دور سے پڑھے جاسکیں۔ آپ عنوانات لکھیے۔

☆ اب اور بٹلہ ہاؤس نہیں۔ No more Batla House

☆ ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔ We are not terrorist

☆ علوی کو رہا کرو۔

☆ مسلم نوجوان کی زندگی سے مت کھیلو

☆ مسلم بستیوں کو نشانہ بنانا بند کرو۔

☆ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی فائلیں دوبارہ کھولی جائیں۔

☆ مظلوموں کے داغ دھوئے جائیں۔

میر صاحب نے مجمع کی طرف دیکھا — پھر کہنا شروع کیا۔ اب غور سے میری بات پر توجہ دیجئے۔ یہ ایک خاموش احتجاج ہوگا۔ ہم کسی بھی حال میں کچھ نہیں بولیں گے۔ ہمارے بینر سب کچھ کہہ دیں گے۔ رات کے اندھیرے میں ہی ہم جنازے کو لے کر چوک کی طرف بڑھیں گے۔ اس وقت اگر چوکسی کرنے والے پولس نے پوچھا یا روکا تو ہم کہہ دیں گے — قبرستان جا رہے ہیں — بینر چوک پر پہنچنے کے بعد ہی کھلیں گے۔ رات کے وقت چوراہے پر بہت کم ٹریفک ہوتا ہے۔ جیسے ہی ہم چوراہے پر پہنچیں گے ہمارے لوگ آنے والے ٹریفک کو روک دیں گے۔ ہم لاش چوراہے کے درمیان میں رکھ دیں گے — لاش سے تھوڑی تھوڑی جگہ چھوڑ کر ہم بطور احتجاج زمین پر بیٹھ جائیں گے — آپ میں سے جو لوگ چادر تکیہ وغیرہ لے جانا چاہیں اس کی اجازت ہے — کیونکہ ضرورت ہو سکتی ہے۔ چوراہے تک پہنچنے سے پہلے تک اس بات کی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔ ہمارے بچے چوراہے پر پہنچتے ہی اپنی اپنی پوزیشن لے لیں گے اور بینر اونچا کر دیں گے — ٹریفک رکتے ہی، کچھ ہی دیر میں اس کی اطلاع نزدیکی تھانوں کو ہو جائے گی — لیکن ہم جنازہ لے کر وہاں پہنچتے ہی اپنی کارروائی شروع کر دیں گے۔ یہاں ہم میں سے کئی لوگ ہیں جن کے پاس موبائل کیمرے ہیں یا جو نیوز چینل میں کام کرتے ہیں۔ وہ فوری طور پر یہاں سے اپنی خبریں چینلس کو بھیجنے لگیں گے۔ تب تک ہماری خبریں ٹی وی پر آنی شروع ہو جائیں گی۔ دوسری اہم بات۔......'

میر صاحب نے غور سے لوگوں کے چہرے جائزہ لیا۔ پھر کہنا شروع کیا —

'مقصد ہے حکومت تک اپنی بات پہنچانا۔ اور علوی جیسے معصوم بچوں کو

[illegible]

نہیں — ہم یہ وقت بڑھا دیں گے — فجر سے ظہر۔ ظہر سے عصر۔ عصر سے مغرب — ہمارا مقصد ہوگا، حکومت اور انتظامیہ کو جھکانا — تاکہ آنے والے وقت میں حکومت اور پولس مسلمانوں کے فرضی انکاؤنٹرس سے دور رہیں — ہمارا احتجاج ہر حال میں خاموش احتجاج ہوگا۔ ہم ہنگامہ نہیں کریں گے۔ اور آپ یقین رکھیں۔ پولس ہم پر کسی طرح کا کوئی حملہ نہیں کرے گی۔ نہ لاٹھیاں برسائے گی۔ کیوں کہ چوراہے پر پہنچنے کے ساتھ ہی ہمارے دوسرے ہزاروں ساتھی بھی اس مقام پر پہنچ چکے ہوں گے۔ ہم اس چوراہے پر ایک دو نہیں لاکھوں مسلمان کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور جب چینلس والے انٹرویو لینے پہنچیں گے تو ہم عام مسلمانوں کو یہاں تک پہنچنے کی دعوت دے چکے ہوں گے — کسی کو اور کچھ جاننا اور پوچھنا ہے۔'

ایک صاحب آگے بڑھے — 'کیا یہ احتجاج کسی مخصوص پارٹی یا ان جی اوز کی طرف سے ہوگا —؟'

'نہیں۔ عام مسلمان کی طرف سے جو ملک کے کسی بھی گوشے میں رہتا ہو — مگر خوفزدہ ہو۔ یہ احتجاج ہم اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے کریں گے۔'

'اور اگر حکومت ایک دن میں جھکنے پر راضی نہیں ہوتی تو؟'

'تو ہم یہ مدت بڑھا دیں گے۔ یہ مت بھولیے کہ ہمارے ساتھ ایک جنازہ بھی ہوگا۔ حکومت یا پولس زندوں کا احترام بھلے نہ کرے، مردوں کا ضرور کرتی ہے۔ علوی کو میڈیا کی ہمدردی بہر طور ملے گی۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ۔ ہم پہلے ایک قدم تو بڑھیں۔ بڑھیں گے تبھی تو تقدیر بھی ہمیں راستہ دے گی۔'

'الحمدللہ۔'

[illegible]

’انشاء اللہ ہم فاتح ہوں گے۔‘

’علوی کو انصاف ضرور ملے گا۔‘

میر صاحب نے لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا— وقت کم ہے اور دو تین گھنٹہ ہی ہمارے پاس ہیں۔ اتنے ہی عرصے میں بینر بھی بننے ہیں۔ جنازہ بھی لے جانا ہے۔ اس لیے میٹنگ برخاست۔ آپ لوگ خاموشی سے اور سرعت سے اپنے اپنے کاموں میں لگ جایئے۔ اور خبردار۔ چوراہے تک پہنچنے سے قبل یہ خبر لیک نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔‘

میر صاحب کے خاموش ہوتے ہی جوش میں ڈوبے ہوئے لوگ آگے کی کارروائیوں کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

••

آسمان پر چاند ستاروں کا رقص جاری تھا۔ درختوں سے گزرتی سرسراتی ہوا میں اداسی کا نغمہ گھلا ہوا تھا—

لوگ جا چکے تھے۔

سڑک سنسان تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز ابھرتی۔ پھر کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا جاتی۔

میں ارشد پاشا...... میں ان تمام واقعات کا گواہ ہوں

آنکھیں بے نور ہو گئی ہیں۔ اور دل پر پتھر جیسا بوجھ...... میں یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ سیاست کیا رنگ لائے گی۔

یا، جو کچھ ہو رہا ہے یا پیش آنے والا ہے، اسے سیاست کا نام دینا چاہیے یا نہیں۔ برسوں سے یا صدیوں سے سلگتی ہوئی چنگاری کبھی کسی ایک لمحے، ایک بیمار

اور سڑتے ہوئے نظام کے خاتمے کی گواہ بن جاتی ہے۔

کیا اس بار بھی ایسا ہو گا۔؟

باہر نکلتے ہوئے میں نے آسمان سے ٹوٹے اک تارے کو دیکھا تھا۔ کیا میں خوفزدہ تھا—؟

یا اسامہ کی یادیں مجھ پر حاوی ہو رہی تھیں؟

میں سب سے آخر میں گیٹ کھول کر باہر آیا تھا—

اور اب سنسان سڑک پر میرے جوتوں کے بجنے کی آواز، وحشت کے گھنگھروؤں کی آواز میں شامل ہو رہی تھی—

(۷)

’ایک دن ہم ہار جاتے ہیں
اور ایک دن
ہم پھر سے جینا سیکھ لیتے ہیں‘

چنگی پر پولس کے سپاہی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پلیا سنسان پڑی تھی۔ عبدل اور باری کی چائے کی دکانیں کھلی تھیں۔ دو ایک سگریٹ کی گمٹیاں بھی کھلی تھیں۔ فٹ پاتھ کی دکانوں کے پاس ایک قطار سے سوئے ہوئے لوگوں کے خراٹے گونج رہے تھے۔ ان کے آس پاس کتے بھی اب بھونکتے بھونکتے سو گئے تھے—

رات کے تین بجنے والے تھے۔ جنازے کو اندھیرے میں خاموشی سے لے

جانے کی تیاری مکمل تھی۔ الگ الگ گروپ میں تھوڑے تھوڑے وقفے بعد لوگوں کو چوراہے تک پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا۔ جنازہ لے کر چلنے والوں میں لگ بھگ ۵۰ سے ۶۰ لوگ شامل تھے۔ نوجوانوں نے بینر کو کپڑوں اور سامانوں میں چھپالیا تھا۔ عورتوں کو یہ بتانے سے منع کیا گیا تھا کہ جنازے کو کہاں لے کر جایا جا رہا ہے۔ ممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ عورتیں عام طور پر راز رکھنے کے فن سے واقف نہیں ہوتیں — امام صاحب ابھی بھی ناراض تھے۔ گو انہیں منانے کی بہت کوشش کی گئی۔ وہ چار قدم جنازے کے ساتھ چلنے کے بعد واپس لوٹ گئے تھے۔

پلیا سے گزرتے ہوئے پٹرولنگ کرتے پولس کے سپاہی الرٹ تو ہوئے لیکن اتنے سارے لوگوں کے ساتھ جنازے کو دیکھ کر وہ پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے — اندھیرے میں دور سے جنازے کے ساتھ سوگواروں کی بھیڑ کو دیکھ کر قطعی ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ یہ کسی نئے انقلاب کی تیاری ہے۔

میر صاحب خاموشی سے آگے آگے جا رہے تھے۔ پلیا اور تنگ سڑکوں سے گزرتے ہوئے چوراہے سے پہلے بھی ایک قبرستان کی چہار دیواری دور سے نظر آتی ہے۔ اب ۴ بجنے والے تھے۔ سڑک اب بھی سنسان تھی۔ یہ مشہور چوراہا تھا، ایک ایسا چوراہا جہاں سے دلی کے مختلف علاقوں کے لیے بسیں آرام سے مل جاتی ہیں۔ صبح ہوتے ہی ۷ بجے کے بعد سے ہی اس چوراہے پر جو ٹریفک کے ہنگامے شروع ہوتے ہیں وہ رات ۱۰-۱۱ بجے تک چلتے رہتے ہیں۔ لیکن اس وقت چوراہے پر خاموشی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر کوئی گاڑی یا بس مختلف سمت کی جانب بھاگتی ہوئی نظر آتی — اور اندھیرے میں دور سے یہ قافلہ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے بہت ساری روحیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہوں۔

کی فضا میں اللہ اکبر کی مدھم سی آواز گونجی۔ عام طور پر کندھا بدلنے والے اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ جنازے کو لے کر دو قدم چلتے۔ پھر ان کی جگہ کوئی دوسرا کندھا دینے والا آ جاتا......

اب چوراہا آ گیا تھا —

سناٹے میں ڈوبا ہوا چوراہا۔ سگنلس گرین تھے۔ میر صاحب نے اشارہ کیا۔ اور سرعت سے ۶۰-۷۰ لوگوں کا یہ قافلہ چوراہا پر پہنچ گیا۔ لاش درمیان میں رکھ دی گئی۔ لاش سے دو گز کا فاصلہ بنا کر چوراہے کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ نوجوانوں نے بینر کھول لیے۔ آنے جانے والی گاڑیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ خاموش احتجاج تھا۔

دس منٹ کے وقفے کے بعد الگ الگ گروپ میں سینکڑوں لوگوں کا جتھا وہاں پہنچ چکا تھا۔ اور اس درمیان پیٹرولنگ، گشتی پولس کے سپاہی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میر صاحب نے انہیں بینر پڑھنے کا اشارہ کیا۔

جنازے کے ساتھ شامل لوگوں نے چوراہے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

کچھ بزرگ لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔ میر صاحب پولس والوں سے باتیں کر رہے تھے۔

'آپ کی مرضی۔ آپ گولیاں چلائیں۔ گولیاں برسائیں۔ لاشوں کے ڈھیر لگائیں — لیکن ہم میں سے کوئی نہیں جائے گا۔ ہم انصاف کے لیے آئے ہیں۔ اور ابھی کچھ دیر میں یہاں لاکھوں کی بھیڑ ہوگی — آپ کیسے روک پائیں گے۔

پولس والوں کی پریشانیاں بڑھ چکی تھیں۔ وائرلیس سے چاروں طرف فون کیے جا رہے تھے۔ میسج بھیجے جا رہے تھے۔ اور ادھر چاروں طرف سے احتجاجی جلسے میں شامل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ جامعہ، بٹلہ ہاؤس، ذاکر نگر

رہی تھی، وہ کسی بھی طرح اس احتجاج میں شامل ہونے کے لیے چلا آرہا تھا۔ کپڑے لباسوں کے ساتھ، پانی کی بوتل لیے۔ کھانے پینے کے انتظام کے ساتھ۔

کچھ ہی دیر بعد یہ علاقہ اچھی خاصی پولس چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چینلس کی گاڑیاں پہنچنے لگی تھی۔ چینلس والوں سے ابھی بات چیت کی اجازت صرف دو ایک ناموں کو دی گئی تھی۔ اور یہ مورچہ پوری طرح میر صاحب نے سنبھال رکھا تھا—

پانچ بجے تک ہلکی ہلکی صبح نمودار ہو چکی تھی۔ دلی الرٹ ہو گئی تھی۔ ہندستان کے بڑے بڑے چینلس ہل گئے تھے۔ زیادہ تر چینلس اس احتجاج کے خلاف تھے۔ سرکاری مشینریاں جاگ گئی تھیں۔ ہوم منسٹر سے پی ایم او تک مسلسل فون ہو رہے تھے

—

اب تک خاموشی تھی۔ میر صاحب کے مطابق، ذرا صبح ہو جانے دیجئے— ہم اپنا موقف آپ کے اور حکومت کے سامنے رکھیں گے— ٹھیک چھ بجے میر صاحب چینلس والوں کے سامنے آئے۔ ایک قطار سے مائک اور کیمرے لگے تھے۔ فلیش چمک رہے تھے۔ میر صاحب نے گلا صاف کیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا—

”ہم ایک لاش کے ساتھ آئے ہیں۔ جنازہ رکھا ہے۔ مگر اپنا خاموش احتجاج ہم آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے آپ وعدے کرتے رہے اور ہم سنتے رہے— سہتے رہے— اس لاش کو دیکھیے۔ یہ اس آدمی کی لاش ہے جس کے معصوم بیٹے کو دو سال قبل آپ نے جیل کی سلاخوں میں بھیج دیا۔ بٹلہ ہاؤس میں ایک انکاؤنٹر ہوتا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے ایک فرضی انکاؤنٹر— اور ایسا صرف میں نہیں کہہ رہا۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور آپ کی میڈیا اور پولس بھی— شواہد بھی ہیں آپ کے پاس۔ اور ایسے تمام شواہد ہیں جو اس پورے معاملے کو فرضی انکاؤنٹر ثابت کرتے

بچوں کو آپ کی پولیس گرفتار کرتی ہے اور ان پر چارج شیٹ لگاتی ہے۔ اس جنازہ کو لے کر اس چوراہے پر رکھنے اور احتجاج کرنے کے مطلب کو سمجھیے— اسے سمجھانا ضروری ہے— پہلی بات یہ ہے کہ اب تک ہمیں آپ ایک سرد لاش سمجھتے رہے— اور ہم بے قصور ہو کر بھی مرتے رہے۔ بے جان اور سرد لاش میں تبدیل ہوتے رہے— لیکن اسی کا دوسرا پہلو بھی ہے کہ اب ہم آپ کے اس منصوبے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جہاں برسوں سے آپ ہمیں سرد لاش میں تبدیل کرتے رہے ہیں— یہاں چاروں طرف دیکھیے۔ آپ کو سر ہی سر نظر آئیں گے۔ اور یہ سب بس کچھ ہی دیر میں ہوا۔ اس میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اور اب آپ جتنا وقت لگائیں گے— یہاں یہ تعداد بڑھتی جائے گی۔ اور آپ اسے روک نہیں پائیں گے.....؛

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم لاش کی سیاست کرنے نہیں آئے— اپنا غم و غصہ ظاہر کرنے آئے ہیں اور آپ سے وعدہ لینے کہ آپ ہمارے ساتھ انصاف کریں گے— جبکہ یہ آپ بھی بہتر جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد آج تک ہم ایک معمولی انصاف کو بھی ترس گئے۔ آپ سے کچھ بھی نہیں چھپا کہ سچ کیا ہے۔ ہم کتنے گنہگار ہیں یا بے گناہ۔ آپ کی خفیہ ایجنسیاں ہیں اور آپ سے بہتر اس حقیقت سے کون واقف ہوگا کہ اکثر دہشت پسندی کی اس واردات میں ہم نہیں ہوتے۔ پھر بھی ہمیں پھنسایا جاتا ہے۔ کسی کو بھی کرتا پائجامہ پہنا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ میڈیا کے سامنے— کتنے بچے ہیں جو گھر سے باہر نکلتے ہوئے کرتا پائجامہ پہنتے ہیں؟ یا اردو جانتے ہیں— اور آپ ہمارے ساتھ مسلسل بے رحم مذاق کیے جا رہے ہیں۔ افسوس یہ کہ ہمارے بیٹے تک آج اردو نہیں جانتے۔ مگر آپ ان کے ہاتھ میں اردو میں لکھی ہوئی ایک پرچی تھما دیتے ہیں۔ اور میڈیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ جسے اپنے ٹی

جاتے ہیں۔"

میڈیا کے فلیش چمک رہے ہیں۔ اس وقت ہندستان کے تمام چینلس کی
بریکنگ نیوز یہی ہے۔ مسلمانوں کا احتجاج—
چینلس چیخ رہے ہیں— باغی مسلمانوں کا احتجاج۔ ہندستان کی مکمل تاریخ
میں مسلمانوں کا ایسا احتجاج کبھی سامنے نہیں آیا—
حزب مخالف اس احتجاج کو دہشت پسندوں کی حمایت بتا رہے ہیں—
چینلس چیخ رہے ہیں— حکومت کیا کارروائی کرے گی؟ کیا ہزاروں
مسلمانوں پر گولیاں چلوائے گی—
حکومت بظاہر جھکنے کو تیار نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر حکومت اس وقت لاچار تھی۔
پی ایم او آفس میں ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی تھی۔ وزیر داخلہ کے بیان جاری کیے گئے
تھے— جس میں پولس کو گولی نہ چلانے کی ہدایت کے ساتھ مسلمانوں سے امن کی اپیل
کی گئی تھی—

میر صاحب مسلسل سرخیوں میں تھے۔ چینلس بار بار ان کے انٹرویو کو ہائی
لائٹ کر رہا تھا......
'آپ مسلمان ہیں تو یہ جنگ آپ کی بھی ہے۔ آپ اب تک گھروں میں
کیوں بیٹھے ہیں۔ باہر نکلیے۔ اور ہمارے اس پرامن احتجاج کا حصہ بنیے۔ اگر آج آپ
نے کوئی آواز بلند نہیں کی تو تیار رہیے، مستقبل میں آپ کی ہر آواز دبا دی جائے گی۔'
'کیا آپ ایک مسلمان باپ ہیں؟ ایمان سے کہیے، کبھی آپ کو ڈر محسوس نہیں

... یا آپ کا بیٹا باہر ہے
تو آپ گھر میں آرام کی نیند سو سکتے ہیں—؟'

••

'یہ آدمی ٹھیک کہتا ہے.....'
'ابھی بھی سو گئے تو آنے والا وقت کبھی معاف نہیں کرے گا۔'
لوگوں کا ہجوم اپنے گھروں سے باہر نکل رہا ہے—
پولس مجبور و بے بس— دور دراز علاقوں سے آنے والوں کا قافلہ— اور
حکومت کو خوف کہ کہیں معاملہ ہاتھ سے نہ نکل جائے—

••

میں ارشد پاشا— ٹی وی سیٹ کے آگے جھکا ہوا انقلاب کی اس نئی آہٹ کا
تجزیہ کر رہا ہوں تو پاؤں شل ہے اور دماغ بے جان۔ جسم سرد—
مجھ سے کچھ فاصلے پر شمیمہ کھڑی ہے—
رباب کی خوفزدہ آنکھوں نے میری طرف دیکھا—
'چائے پئیں گے؟'
'نہیں—'
رباب کے چہرے پر وحشت کی پرچھائیاں تیر رہی ہیں۔
'یہ سب کیا ہے؟'
'نہیں جانتا—'
'کیا ان لوگوں کو یہ سب کرنا چاہیے تھا—؟'
میری آواز کمزور ہے— 'نہیں جانتا— لیکن بتاؤ رباب راستہ کیا ہے۔
راستے بند ہیں۔ جب سارے راستے بند ہو جاتے ہیں، سانس گھٹنے لگتی ہے تو ہم کیا

ہو جاتے ہیں......'

'وہ دیکھیے......' رباب نے اشارہ کیا— میرٹھ، بلند شہر، مراد آباد...... لوگ
اپنے اپنے گھروں سے نکل کر، بسوں پر سوار دلی کی طرف کوچ کر رہے ہیں— چینلس
کے نمائندے مختلف شہروں سے اپنے پیغامات بھیج رہے ہیں— بہار، یوپی، ممبئی، اڑیسہ،
کولکتہ، کیرل، چینئی...... تمام جگہوں پر مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر—

'یہ سب بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔'

'پچیس کروڑ کی آبادی دوسرے درجے کا شہری بنا کر رکھ دی گئی—'

حزب مخالف کے ہوش اڑ گئے تھے...... بٹلہ ہاؤس چوک پولس چھاؤنی میں
تبدیل ہو چکا تھا— بہت سارے این جی اوز مسلم حمایت میں سامنے آ گئے تھے۔
کمیونسٹ پارٹی اور کئی دوسرے پارٹیوں نے بلا شرط علوی کو رہا کرنے کی مانگ اٹھائی
تھی۔ راشٹریہ کانگریس کے نیتا رگ وید سنگھ کا بیان آ گیا—

'میں پہلے ہی کہتا تھا کہ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر ایک فرضی انکاؤنٹر ہے—'

چاروں طرف سر ہی سر— حکومت کی طرف سے بیان آ گیا تھا۔ قانون کو
اپنا فیصلہ کرنے دیجیے۔ حکومت ان مانگوں کو ماننے سے قاصر ہے۔

میں ڈرائنگ روم میں آیا تو رباب اسامہ کی ایک بڑی سی تصویر ہاتھ میں
لیے، شیشہ پر پڑی گرد صاف کر رہی تھی۔ شمیمہ کی آنکھیں بے نور اور بے حرکت ہو رہی
تھیں— مجھے دیکھ کر رباب ٹھہر گئی—

'بیٹے کی یاد آ رہی ہے؟'

'ہاں—' رباب نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی صاف نظر آ رہی

شاید ان لوگوں کو [illegible] کرنے سے......'

بولتے بولتے وہ ٹھہر گئی تھی—

'ہونہہ—' میں نے گہری سانس لی— 'تمہاری الجھنیں سمجھ سکتا ہوں
رباب— ممکن ہے وہ جہاں بھی ہو، یہ منظر وہ بھی دیکھ رہا ہو......'

'ہاں—' رباب کو تسلی ملی تھی...... بہت ممکن ہے، اسے اس بات کا احساس ہو
کہ اس کی لڑائی بھی لڑی جا سکتی ہے۔'

'ہاں—'

شمیمہ غور سے ہم دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی پتلیوں میں لرزش تھی۔

'بھائی جان آ جائیں گے......؟'

'ہاں کیوں نہیں۔ ضرور آئیں گے—' رباب نے شمیمہ کو پیار سے لپٹا لیا۔
اور تجھے معلوم، وہ سارا سارا دن تمہارے پیچھے پیچھے گھوما کرے گا۔'

شمیمہ کے چہرے پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ تھی، جسے لفظوں کا لباس پہنانا
اس وقت میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا—

میں دوبارہ ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھاپڑ کی آواز میرے کانوں میں
گونج رہی تھی۔ اس نے دو بجے کا وقت دیا تھا— مجھے ہر حال میں اس سے ملنے
جانا تھا— لیکن ابھی اس وقت گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر جو کہانی لکھی جا رہی تھی اس
نے مجھے خوف ودہشت میں مبتلا کر دیا تھا— میرا دل کہہ رہا تھا، اس احتجاج سے کوئی
نتیجہ برآمد نہیں ہوگا— بلکہ الٹا اس سے مسلمان سوالیہ گھیرے میں آ جائیں گے—
میں ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہوں۔ ٹی وی پر مون ٹی وی کا نمائندہ پر تشویش

'آپ اس بڑھتی ہوئی بھیڑ کو دیکھیے اور نظر انداز مت کیجیے
یہ وہی لوگ ہیں۔ یا وہی مسلمان جو روزانہ ہم سے ملتے ہیں۔ دفتروں میں
کام کرتے ہیں۔ ہمارے دوست، ہمارے کلیگ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے کوئی گلہ
کوئی شکایت نہیں کرتے۔ اپنے درد کو پی جاتے ہیں۔ کسی بھی آتنک وادی کارروائی میں
ان کی قوم، ان کے مذہب کا آدمی سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ ہم سے منہ چھپائے پھرتے
ہیں۔ لیکن ایک سچ یہ بھی ہے اور اس سچ کو اب مان لینا چاہئے کہ ہر جگہ، ہر آتنک وادی
کارروائی میں کوئی مسلمان نہیں ہوتا — ہندستان کی جیلوں میں آتنک واد کے نام پر
ہزاروں لاکھوں بے قصور مسلم بچے سڑ رہے ہیں۔ ان کے پاس بھوشیہ، فیوچر یا مستقبل
کے نام پر کوئی بھی خواب اب باقی نہیں بچا ہے — کون ہے اس کا ذمہ دار — اس
بھیڑ کو پہچانیے۔ یہ اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ یہ آپ کے اپنے ہیں۔ اور اب ان کے
برداشت کرنے کی حد ختم ہو چکی ہے تو یہ اپنی مانگوں کو لے کر سڑکوں پر آگئے ہیں —'

ٹھیک یہی وقت تھا، جب حکومت کے نمائندے شاہی امام سے مل رہے
تھے۔ اور کچھ ہی دیر بعد شاہی امام کا فرمان بھی آگیا —
'مسلمان ہوش میں رہیں اور ملک کے آئین پر اعتبار کرنا سیکھیں کسی کے کہنے
پر نہ آئیں — احتجاج کے دوسرے بھی پرامن طریقے ہیں — علوی کو حکومت سے
انصاف ہم دلائیں گے —'
لکھنؤ، بریلی، دارالعلوم سے بھی مسلمانوں کو ہوشیار کرنے والے ردعمل
سامنے آگئے تھے —
صبح کے آٹھ بج گئے تھے۔ سیاست الجھ گئی تھی۔ مسلم لیڈران دو حصوں میں

تم اٹو پے ہے۔
اور یہاں بٹلہ ہاؤس چوک پر ایک لاش رکھی ہوئی تھی۔ آسمان میں کہیں دور
اڑتے ہوئے گدھ بھی تھے — اور ان سے الگ سیاست کی گرم ہوا تھی۔
سب اپنے اپنے مہرے چل رہے تھے۔
میر صاحب کی آواز ٹی وی اسکرین پر گونج رہی تھی —
'علوی جیل میں ہے۔ معصوم اور بے قصور...... اور ہندستان کی دوسری جیلوں
میں اب بھی ہزاروں لاکھوں معصوم علویوں کو قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔ اور ان سب کا
ایک ہی جرم ہے۔ ان نوجوانوں کا مسلمان ہونا۔ اگر آپ ایسے ہی کسی علوی کے رشتہ دار
ہیں، باپ ہیں تو انصاف کی آس لگائے بیٹھے نہ رہے۔ گھر سے باہر نکلیے۔ اور ہماری
اس حق کی لڑائی میں ہمارا ساتھ دیجیے۔'

میں ارشد پاشا...... میں بالکنی پر آگیا ہوں...... صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔ دھوپ
چاروں طرف پھیل چکی ہے — آنکھیں نیلے آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ ایک چہرہ
نمودار ہوتا ہے...... میرے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے...... پھر ایک کمزور آواز
سرنکالتی ہے......
'یہ تم کہاں بھٹک رہے ہو اسامہ......؟'
'کہیں تو نہیں —'
'کبھی اجودھیا، ہری دوار...... کبھی سنگھ کے لوگوں کے شامل......؟'
'ہاں......'
'لیکن کیوں......؟'
'یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم......'

تھے۔ چلو کوئی بات نہیں۔ مگر سچ بتانا، تمہیں کبھی ماں کی یاد بھی

'آتی ہے......'

'پھر آ کیوں نہیں جاتے۔ چلے آؤ — اس گھر کی اداسی اور ویرانی تمہارا انتظار

کر رہی ہے —'

یقیناً میری آنکھیں نم تھیں...... میں اس وقت چونکا، جب رباب پاس آ کر

کھڑی ہوگئی۔

'تم نے سنا۔'

'کیا......؟'

'اب فسادات بھی شروع ہوگئے۔ اعظم گڑھ اور مالیگاؤں میں جلوس کے لے

کر دو گروپ میں جھڑپ ہوگئی۔'

میں نے مسکرانے کی کوشش کی — 'میں نہیں جانتا، اس بغاوت کا نتیجہ

کیا ہوگا۔ مگر بغاوت اکثر تشدد کی آگ کو لے کر آگے بڑھتی ہے —'

۹ بجے تک وزیر داخلہ کا بیان آ گیا۔ علوی کو چھوڑنا ناممکن ہے۔ مسلمانوں کی

مانگوں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے وقت چاہیے۔ مسلمان انصاف اور قانون

پر بھروسہ بنائے رکھیں — حکومت نے تمام پارٹیوں کی میٹنگ بلائی ہے جہاں اس مسئلے

پر غور و خوض کیا جائے گا۔'

اپوزیشن اس بغاوت کو مسئلہ ماننے کو تیار نہیں تھی —

وہ تنگ وادیوں کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھی —

اپوزیشن اسے پاکستان کی نئی سازش قرار دے رہی تھی۔ لاش کے لیے برف

کی سلیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ دھوپ کی تمازت سے برف تیزی سے پگھلتی جا رہی

تھی — اوکھلا چوک کا ڈرامہ برہم ہو چکا تھا۔ سیاست میں مزید گرمی آ چکی تھی —

دس بجتے بجتے تھاپڑ کا فون آ گیا —

'کہاں ہو تم......'

'میں تو یہیں ہوں۔'

دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی۔ 'یہ کیا کرنے لگے ہو۔ یہ تمہیں نہیں کرنا

چاہیے تھا۔'

'مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔'

'وہی جو تم کر رہے ہو۔'

'میں کیا کر رہا ہوں۔'

'اب اتنے بھولے بھی مت بنو — سیاست — ایک لاش کی سیاست۔'

اب مجھے غصہ آ گیا تھا — ایک لاش اگر پچیس کروڑ مسلمانوں کا حق مانگتی ہے

تو گناہ کیا ہے۔'

'گناہ یہ ہے کہ لاش بول نہیں سکتی۔ کیا پچیس کروڑ کی آبادی ایک لاش میں

تبدیل ہو چکی ہے، تم یہ کہنا چاہتے ہو۔'

'نہیں۔ پچیس کروڑ کی آبادی اب لاش میں تبدیل نہیں ہوگی۔ یہ کہنا چاہتا

ہوں۔'

'ہونہہ۔' دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ جیسے تھاپڑ کے

چہرے پر فکر کی چادر تن گئی ہو۔

میرے لیے یہ تھاپڑ کا نیا چہرہ تھا۔

تھاپڑ کی آواز دوبارہ ابھری —

'اس کے باوجود ڈرامہ بلّا ہاؤس چوراہے پر کھیلا جا رہا ہے۔ میں اس کی

حمایت نہیں کروں گا— اس طرح کوئی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ اور انقلاب کے نمائندے کون ہیں۔ میر صاحب— میں نے ان کے بارے میں پتہ لیا ہے۔ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ یہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو مسلم ٹکڑوں کی سیاست میں زندگی گزار دیتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا—'

میری آواز زخمی تھی۔ میر صاحب غلط ہو سکتے ہیں لیکن یہ احتجاج غلط نہیں ہے۔ کوئی بھی اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو کب تک برداشت کر سکتا ہے۔ ہزاروں بے قصور نوجوان جیلوں میں بند ہیں۔ آتنک واد کی ہر کارروائی کے بعد پولس ایک اسلامی جہادی تنظیم اور چند مسلمان چہروں کو سامنے لا کر بچ نکلتی ہے۔ کبھی تو انصاف ہو گا—'

'تو انصاف چاہتے ہو تم......؟'

'ہاں—'

'اور انصاف کے لیے میر صاحب جیسے لوگوں کا آسرا ہے۔'

'نہیں—'

اس بار میں زور سے ہنسا—' لگتا ہے کہ ٹی وی نہیں دیکھتے—بٹلہ ہاؤس چوک کیوں نہیں آ جاتے۔ ہزاروں لاکھوں کے اس ہجوم کو دیکھ کر تم بھی ڈر گئے ہوتے تھاپڑ۔ اور یہ ہجوم صرف چند گھنٹوں میں اکٹھا ہوا ہے۔ صرف ۷-۶ گھنٹوں میں ایک بڑی مسلم آبادی اگر احتجاج کے لیے جمع ہو سکتی ہے تو سوچ سکتے ہو، چھ سات دنوں میں اس کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ یہ آزادی کے ۶۵ برسوں کی دبی ہوئی آگ ہے تھاپڑ، جنہیں اب نکلنے کا موقع ملا ہے۔'

تھاپڑ کی آواز کمزور تھی— 'پھر بھی میں کہتا ہوں۔ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ مسلمانوں نے احتجاج کے لیے صحیح وقت کا انتخاب نہیں کیا— کیا اب بھی تم سمجھتے ہو کہ حکومت خود سے کوئی فیصلہ لے سکتی ہے۔ اور دوسری پارٹیاں خاموش رہ جائیں گی—'

'...میں یہ سب جاننا نہیں چاہتا—

'خیر چھوڑو۔ دو بجے آ رہے ہو نا......'

مجھے اچانک تھاپڑ کی آواز میں ایک خاص چمک محسوس ہوئی تھی۔

'ہاں۔ ضرور آؤں گا—'

'میں تمہارا انتظار کروں گا۔'

فون کاٹ دیا گیا تھا—

میں گہرے سناٹے میں تھا۔ ایک ایسے سناٹے میں جس کا کوئی انت نہیں۔ کیا یہ سچ مچ تھاپڑ تھا۔ وہی تھاپڑ جو کاشی کی گلیوں سے اب تک میرے ساتھ تھا— میرے لیے نوکری کی تلاش کرنے والا، میرے زخموں پر مرہم رکھنے والا۔ میرے بچوں کی دلجوئی کرنے والا، اسامہ کے لیے میرے ساتھ شہر شہر مارا مارا پھرنے والا— مسلمانوں کی حمایت میں آواز بلند کرنے والا—

پھر یہ تھاپڑ کون تھا، جو فون پر مجھ سے مخاطب تھا......

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا—

دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

بارہ بجے تک میر صاحب کا نیا اعلان بھی سامنے آ گیا۔ جب تک حکومت علوی کو رہا کرنے کا فیصلہ نہیں لیتی، یہ لاش یہاں سے نہیں ہٹے گی— ہم تب تک یہیں ڈٹے رہیں گے۔ علوی کے ساتھ بٹلہ ہاؤس حادثے میں جن معصوم نوجوانوں کو پولس نے گرفتار کیا ہے، حکومت انہیں بھی آزاد کرے— حکومت بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کو فرضی انکاؤنٹر گھوشت کرے— اور مقتول انسپکٹر ورما کو دیا جانے والا سرکاری تمغۂ حکومت

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ سب کچھ تیزی سے بدلتا ہوا — ایک بدلتی ہوئی دنیا — بدلتا ہوا نظام — اور اس نظام میں سانس لیتا ہوا انقلاب۔ اور دوسری طرف — وہ سہمے ہوئے نوجوان مسلم چہرے جنہیں ٹی وی اسکرین پر دیکھتے ہوئے گھبراہٹ ہونے لگی تھی —

یہ سیاست اس وقت مجھے پاگل بنا رہی تھی۔ مجھے تھاپڑ سے بھی ملنا تھا —

ساڑھے بارہ بجے تھاپڑ کا فون آ گیا —

'تم کسی طرح کناٹ پلیس ریولی سینما پہنچ جاؤ۔ میرا ایک آدمی تمہیں لینے آئے گا — پریشان مت ہونا۔ وہ آدمی تمہیں پہچانتا ہے۔'

فون کاٹ دیا گیا —

میرے جسم میں ہزاروں کی تعداد میں چیونٹیاں سرسرا رہی تھیں۔ جو سوال اندر پیدا ہو رہے تھے ان کا جواب صرف اور صرف تھاپڑ کے پاس تھا —

(۸)

بندے ماترم

یقیناً تم وہ سب کچھ نہیں دیکھ پاؤ گے/
جنہیں تم دیکھنا چاہتے ہو/

ریڈ الرٹ۔ سڑک پر چاروں طرف پولس چھائی ہوئی تھی۔ میں باہر نکلا تو زیادہ تر علاقے کی دکانیں بند نظر آئیں۔ چاروں طرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ چائے کے ہوٹل اور پان کی گمتیاں بھی بند تھیں — مجھے یقین تھا، بس کی تلاش بے سود ہوگی — سڑک پر ایسا ماحول تھا جیسے عام طور پر کرفیو کے موقع پر ہوتا ہے۔ مگر یہی بات بٹلہ چوک کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی تھی —

یہاں ان اطلاعات کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں ریولی سینما تک کیسے پہنچا۔ یہ تفصیلات بے رنگ ہیں اور ان کا جاننا کوئی ضروری نہیں۔ مگر ٹھہریے۔ کیا آپ جادو پر یقین رکھتے ہیں؟ طلسمی کہانیوں پر — جیسے عام طور پر آپ کسی عجوبہ یا واقعہ کو یہ کہہ کر کہہ دیتے ہیں۔ یہ کہانی تو فلمی ہے —

مگر اس وقت میں حیران کرنے والی ایسی ہی ایک دنیا کا مسافر تھا — اور ان چاند تاروں کی گواہی میں یہ کنفیشن میرے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل سطور میں جو کہانی آپ پڑھنے جا رہے ہیں، وہ حرف بہ حرف سچ پر مبنی ہے۔ کبھی کبھی سچ بالکل

سامنے ہوتا ہے۔ اور ہم اس سچ سے کتنے بیگانہ ہوتے ہیں ——

ایک ایسی کہانی جس کے آگے طلسم ہوشربا کی کہانیوں کی چمک بھی دھندلی پڑ جائے —— میں ارشد پاشا، میں اس طلسمی دنیا سے واپس آ گیا ہوں۔ میرے قلم میں اس وقت لرزش ہے اور بہت ممکن ہے، میری چشم نم نے جو بے رحم نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے...... وہ میں اس طرح بیان بھی نہ کر پاؤں اور اس کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں —— میری آنکھوں کی پتلیاں ابھی بھی ساکت اور بے جان ...... اور ہاتھوں میں قلم کانپتا ہوا......

جیسے ہی میں ریولی پہنچا، ایک نیلے رنگ کی پرانی فیٹ کار میرے پاس آ کر رک گئی ——

'بیٹھ جائیے ——'

میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا —— میرے ساتھ والی سیٹ پر پچیس سال کی ایک خوبصورت سی لڑکی تھی —— وہ سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ڈرائیور نے بھی ایک بار بھی پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ بارہ کھمبا روڈ کراس کراتے ہی لڑکی نے بغیر میری طرف دیکھے ایک سیاہ رنگ کا چشمہ میری طرف بڑھایا —— وہ شستہ اردو میں بات کر رہی تھی۔

'معاف کیجئے گا۔ آپ کو تکلیف ہوگی۔ مگر آپ اسے پہن لیجئے۔ اسے کچھ دور تک، جب تک ہم منزل تک پہنچ نہیں جاتے، آپ اسے پہنے رکھیے گا۔'

میں خود کو نظر بند محسوس کر رہا تھا۔ چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہی میں اپنی دنیا کا قیدی بن گیا تھا —— ظاہر ہے، میرے لیے اس سیاہ چشمہ کو پہننے کے بعد یہ قیاس کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ ہم کن راستوں سے گزر رہے ہیں۔

[illegible] کے نقشے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہے نہ جانے [illegible] پر چڑھے [illegible] گھنٹے [illegible] ہوں گے۔ گاڑی کے کسی عمارت میں داخل ہونے تک مجھے گیٹ کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ کچھ ہی لمحے بعد پاس والی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ اس بار لہجے میں ملائمیت اور اپنائیت شامل تھی۔

'اب چشمہ اتار دیجئے۔'

گاڑی سے اترتے ہی سامنے ایک دروازہ تھا۔ مجھے دروازے سے اندر لے جانے والا ایک نوجوان تھا، جس نے لڑکی کو کچھ اشارہ کیا —— یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا —— دھوئیں سے اٹے ہوئے تھے۔ میں نے جائزہ لیا تو دیواروں پر کسی بھی طرح کی کوئی پینٹنگ نہیں تھی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہاں کیوں اور کس ارادے سے لایا گیا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھا کہ آخر تھاپڑ جیسے دوست سے ملنے کے لیے اتنے انتظامات کیوں کیے گئے ہیں ——؟ وہ بھی خفیہ انتظامات...... جیسے میں یہ جگہ حفظ نہ کر لوں...... جو بعد میں تھاپڑ جیسوں کے لیے مصیبت ثابت ہو ——

یہ کون سا علاقہ ہے —— کون سی جگہ ہے، میں یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں تھاپڑ سے ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں جاننا چاہتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ معمولی سا دکھنے والے تھاپڑ نے خود کے لیے اتنے سارے پردے کیوں بنا رکھے ہیں —— مگر ان سب سے بڑی حقیقت اس وقت یہ تھی کہ میرے دل نے تیز تیز دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

مجھے ایک چھوٹی سی سرنگ سے گزار کر ایک بڑے ہال نما کمرے میں لے جایا گیا۔ اور اچانک میں ٹھہر گیا۔ کمرے سے بندے ماترم کے بول ابھر رہے تھے۔ سنگھ کے مخصوص لباس میں ۱۸ سے ۲۰ لڑکے تھے جو قطار میں کھڑے سر میں بندے ماترم گا رہے تھے۔ ان کے پشت کی دیوار سفید اور خالی تھی۔ جولڑکے بندے

تھا جس کا نام اب سنگھ تھاپڑ تھا۔

ایک بجلی چمکی اور مجھے حیران کر گئی—

گیت ختم ہو چکا تھا۔ تھاپڑ میرے سامنے تھا۔ اس کی شکل بدلی ہوئی تھی۔ لباس بدلا ہو تھا۔ اس وقت وہ سفید کرتا پائجامہ میں تھا۔ سر پر سفید سی ٹوپی تھی، جیسی ٹوپیاں عام طور پر سنگھ کے لوگ پہنتے ہیں— مجھے دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

'آؤ میرے ساتھ۔'

اس کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا—

اب ہم اس کمرے میں تھے جو ایک طرح سے اس کی لیبارٹری تھی۔ کمرے میں ایک قطار سے چار کمپیوٹر تھے جن کو آپریٹ کرنے والے چارلڑکے تھے۔ کمرے میں خوشبودار اگربتی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ کتابچے اور پوسٹر تھے جو آسانی سے اپنی کہانی بیان کر گئے تھے کہ اس وقت میں کہاں ہوں......

ایک معمولی سی میز اور کرسی تھی۔ سامنے والی کرسی پر تھاپڑ بیٹھ گیا۔ اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا—

اس کی آنکھیں مجھے بغور دیکھ رہی تھیں......

'شاید تمہارے لیے اب یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں؟'

'ہاں۔' میری آواز بھی سرد تھی۔

'کچھ اشارے ان پوسٹرس اور ان کتابچوں سے مل گئے ہوں گے۔ میں نمائش میں یقین نہیں رکھتا۔ اس لیے میرے آفس سنبھالنے کے بعد دیواروں سے ساری

کہ ہم کیا کرنے جارہے ہیں— یہاں ۳۰ بچے ہیں جو میری نگرانی میں کام کرتے ہیں—' اس نے ٹھنڈی سانس بھری— 'میں کالج کے دنوں سے ہی اس تحریک سے وابستہ تھا۔ مگر میری وابستگی کی شکل مختلف تھی۔ میں نے سنگھ کو جوائن کرنے کے بعد ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا— مجھے مسلمانوں کو سمجھنے دیجئے۔ اس میں زندگی بھی گزر سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم بغیر مسلمانوں کو سمجھے اپنا کام کیے جارہے تھے...... سنگھ کی طرف سے ہری جھنڈی ملتے ہی میں اپنے کام میں لگ گیا— اور یقینی طور پر سنگھ مسلسل میرے کاموں پر نظر رکھ رہا تھا۔ پھر مجھے تم مل گئے...... مجھے ایک مسلمان کو مکمل طور پر جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک مسلمان گھر کی ضرورت تھی— اور تم میری یہ مشکل آسان کیے جارہے تھے......'

تھاپڑ سنبھل سنبھل کے بول رہا تھا۔ میرے جسم میں جیسے برف جم چکی تھی۔ سرد برف...... میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھاپڑ کی بے جان آنکھوں میں میرے لیے نہ کوئی جذبات تھے، نہ احساس بلکہ آنکھوں کی پتلیاں ساکت اور بے جان معلوم ہوئیں—

'میں اپنی کیفیت، اپنے تجربے تحریری طور پر سنگھ کو دے رہا تھا۔ اور میرا مقصد واضح تھا۔ آپ ایک جنگ اس وقت تک نہیں لڑ سکتے جب تک آپ ایک مسلمان فکر کو اندر اندر تک سمجھ سکنے سے محروم رہتے ہیں— میں نے کہہ رکھا تھا، ہوسکتا ہے میری زندگی اس تجربے میں ختم ہو جائے مگر میرے بعد یہ تحریریں سنگھ کے کام آئیں گی— کیونکہ آزادی کے بعد کے مسلمانوں کو سمجھنا آسان کام نہیں۔ یہ کئی حصوں میں بٹے ہوئے لوگ ہیں۔ ایک بڑی آبادی تعلیم سے بے بہرہ ہے— مڈل کلاس مذہب اور سیکولرزم کے درمیان پناہ تلاش کر رہا ہے۔ ایلٹ کلاس کے طبقے کی فکر الگ ہے۔

ہیں۔ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتے تھے — ان باتوں سے زیادہ یہ سمجھنا کہ تم لوگ عام زندگی کیسے گزارتے ہو۔تمہاری زمین کیا ہے؟تمہاری زمین کے مسائل کیا ہیں؟تم کن سطحوں پر سوچتے اور جھکتے ہو۔تمہیں کیسے کمزور کیا جاسکتا ہے۔ ہاں۔ تمہیں کیسے داس بنایا جاسکتا ہے — اور میں کہہ سکتا ہوں، یقینی طور پر اس تجربے میں تم میرا پورا ساتھ دے رہے تھے —

تھاپڑ ایک لمحے کو ٹھہرا —

اب وہ بغور میری طرف دیکھ رہا تھا، جسے اس وقت کے میرے جذبات یا احساس کو سمجھنا چاہتا ہو —

میری مٹھیاں بار بار بند اور کھل رہی تھیں۔آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا —

'ایک بڑی جنگ — ایک عقیدے کو باریکی سے سمجھنے کے لیے ایک زندگی بھی کم ہوتی ہے — میں تمہاری مضبوطی اور تمہاری کمزوریوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔اور میں بہت حد تک سمجھ بھی گیا تھا۔میرے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں کو جاننا ضروری تھا۔تمہارا بادشاہ بابر جب پہلی بار ہندستان آیا تھا تو جانتے ہو اس نے اپنے فوجیوں سے کیا کہا تھا — یہ ہندوؤں کا ملک ہے۔ہندو سیدھے اور شریف ہوتے ہیں۔انہیں سمجھنا ہے تو قوت بازو سے نہیں۔ان سے گھل مل کر انہیں سمجھنا شروع کرو — ہم تمہیں یعنی ایک عام مسلمان کو اتنا ہی جانتے تھے، جتنا باہر کی دنیا میں دیکھتے تھے، پھر تمہاری کمزوریوں سے تمہاری عام روٹین سے واقف کیسے ہوتے۔اور ان کے بغیر تم پر حکومت کیسے کرتے'

تھاپڑ کی آواز سرد تھی۔'ہم شانتی سے رہنے والے لوگ تھے۔ یہ ہماری زمین

[illegible] یہ ... اور یہاں [illegible] نے اپنے ناپاک پاؤں پھیلا دیے۔۷۰۰ برسوں کی غلامی [illegible] کام [illegible] سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ یہ سوچ کر۔ کہ ایک دن...... ایک دن ہم تمہارے وجود سے اس زمین کو پاک کردیں گے۔ سمجھ رہے ہو نا تم...... اس کام میں وقت لگے گا۔لیکن...... یہ کریں گے ہم۔ہم بھارت کو ایک جمہوری مملکت کے بجائے ایک ہندو راشٹریہ بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی ہندو مملکت جہاں صرف ہماری حکومت ہو۔اور اس لیے آزادی ملنے کے بعد سے ہی ہم نے سابق فوجی افسروں کو ملانا شروع کیا۔ چھوٹی موٹی کامیابیوں سے ہمارے حوصلے بلند ہوئے۔ ناکامیوں سے ہم گھبراتے نہیں — کیوں کہ ہر ناکامی آگے آنے والی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے — لیکن......'

تھاپڑ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا — تمہارے بیٹے نے سب گڑ بڑ کردیا۔ وہ اسی راستے پر چلا، جس راستہ پر ہم چلے تھے۔ ہم اسے مار سکتے تھے۔ لیکن ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کیا کرتا ہے۔اس نے وہ کیا، جو سو سال میں ہم نہیں کرپائے۔اس نے ہندو تیرتھ استھانوں کو چنا — مندروں اور آشرم کو چنا — اور اپنی شناخت کے ساتھ ہمارے دھرم گروؤں کا دل جیتتا چلا گیا — سنگھ میں گھبراہٹ تھی۔لوگ جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے'

تھاپڑ ایک لمحے کو ٹھہرا۔وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پشت پر ہاتھ باندھے وہ ٹہلنے لگا — مجھے ساری زمین گھومتی ہوئی محسوس ہورہی تھی — ذہن و دماغ پر مسلسل دھماکے ہورہے تھے۔ میں کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔آنکھوں کے آگے گھہرے سناٹے کا جال بن دیا گیا تھا —

تھاپڑ کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔اس نے میری طرف دیکھا۔

ہمارے مشن جیسا کام کر رہا تھا۔ وہ بھی ہم سے [illegible] ہر جگہ اپنی پہچان کو محفوظ رکھتے ہوئے — تم سمجھ رہے ہونا، اور ہم...... اب تک نا کامیاب اس لیے رہے کہ ہم مہرے تو چلتے رہے لیکن اپنی پہچان چھپا کر......'

میرے اندر خوف کی بارش ہو رہی تھی۔

'تم لوگ اسے مار تو نہیں ڈالو گے۔'

'بالکل بھی نہیں۔'

تھاپڑ کا لہجہ سرد تھا — 'انسان کو مارا جا سکتا ہے — دو چار دھارا کو نہیں۔ وہ ایک دو چار دھارا ہے کہ ہوا کا رخ یوں بھی بدلا جا سکتا ہے — ہمارے لیے وہ جب تک زندہ ہے۔ ایک ادھین کینڈر ہے۔ سمجھ رہے ہو نا — سیکھنے کی جگہ ہے وہ — اسے ماردیں گے تو بہت کچھ سیکھنے سے ونچت رہ جائیں گے۔ اسے سمجھنا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ چھپ کر اس کی کارروائیوں کو دیکھنا ہے۔ اور مورکھ، تم سمجھ رہے تھے کہ میں تمہاری مدد کر رہا ہوں — جبکہ میں اپنے سوارتھ میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں ملے گا —'

تھاپڑ مسکرایا۔ 'آؤ تمہیں اپنے مشن کے کچھ ساتھیوں سے ملواؤں......'

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت میری موجودگی کسی روبوٹ یا غلام جیسی تھی جسے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔

ایک چھوٹے سے ہال میں لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر اسکرین پر کام کرتے ہوئے آپریٹر ہمارے قدموں کی آہٹ کے باوجود اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اسکرین پر عربی الفاظ جگمگا رہے تھے...... میں حیرت سے لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر اسکرین کو دیکھ رہا تھا......

تمہاری تحریکیں ڈیزائن کی جارہی ہیں۔ اسلامی ویب سائٹس تیار کیے جارہے ہیں۔'

'مطلب؟'

'ایک بڑی جنگ کے لیے تمہارا Shadow بننے کی تیاری —'

ان لوگوں سے ملو۔ یہ راہن ہے۔ یہ اروند پاریکر، یہ ارجن رام دیو...... یہ گنیش شریواستو...... یہ سارے لوگ عربی جانتے ہیں۔ یہ سب اپنے کام میں ماہر ہیں — دراصل تم سے ملنے کے بعد......'

تھاپڑ مجھے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آیا...... اور اچانک میرے جسم میں میزائلیں چھوٹنے لگیں۔ میں ہکا بکا سا وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ سامنے کمرے میں ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے جماعت کھڑی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ یہ کوئی نماز کا وقت نہیں تھا۔

امامت کرنے والے شخص کی قرأت میری روح کو معطر کر رہی تھی۔ ایسی شاندار قرأت میں نے کیو ٹی وی اور پیس ٹی وی پر تو سنی تھی مگر یہاں، اس ماحول میں اس تعلق سے سوچنا میرے لیے کسی خواب کی مانند تھا......

میں حیران نظروں سے تھاپڑ کو دیکھ رہا تھا...... 'یہ...... یہ لوگ......'

'آؤ۔ میرے ساتھ۔ نماز پڑھنے کے بعد یہ لوگ سیدھے میرے کمرے میں آئیں گے۔ تمہیں یاد ہے۔ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ یعنی تم سے ملنے کے بعد......'

تھاپڑ مجھے لے کر دوبارہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا تھا — ہم آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے —

کو—پہلے انہیں جاہیے—ان میں کھلے ملیے۔ ان [illegible] اردو [illegible] سیکھیے۔تلفظ اورقرآن شریف کو سمجھنا سیکھیے۔ مجھے ایک ایسی فوج چاہیے جو اردو جانتی ہو۔عربی جانتی ہو۔صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن شریف پڑھ سکتی ہو۔ ان کے معنی سمجھتی ہو— ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت کم تھی جو ہندی یا سنسکرت جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ تو ہمارے ہیں ہی۔ جادو تو اصل میں تم لوگوں پر کرنا ہے۔ اور تم پر حکومت کرنے کے لیے سب سے پہلے تمہیں قریب سے سمجھنا ہے—'

دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں تو اٹھارہ سے بیس لوگ تھے، جو کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ان کے سر پر ٹوپیاں تھیں۔ پیشانی پر سیاہ نشان تھا، جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ قیامت کے روز یہاں سے نور پھوٹے گا—ان میں کچھ کے چہرے پر داڑھیاں بھی تھیں۔ یہ ایک قطار سے کمرے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

'گھبراؤ مت۔آؤ۔ان میں سے کچھ کا تعارف کراؤں۔'

'یہ درون ہے۔درون امامت کر رہا تھا۔'

'السلام علیکم'

درون نے وہیں کھڑے کھڑے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا—

'یہ باگیشور۔یہ گھنشیام...... یہ ست...... یہ اروند......'

میں پاگلوں کی طرح ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں...... پیشانی کے سیاہ نشان کو...... ان کے چہروں کو...... دنیا گھوم رہی تھی...... مجھے چکر آ رہے تھے۔

'جاؤ تم لوگ۔'

تھاپڑ نے اشارہ کیا۔میرے ہاتھوں کو تھاما۔ مجھے لے کر کرسی پر بیٹھایا—

'ڈرومت۔نماز صرف تم ہی نہیں پڑھتے۔انہیں باضابطہ صحیح نماز پڑھنے کی ٹریننگ دی گئی ہے۔اور ان کی...... پیشانیوں پر جو سیاہ داغ ہے وہ بھی نقلی نہیں۔یہاں کچھ بھی نقلی نہیں ہے دوست۔ہم انہیں اور یجنل اسامہ......یعنی مسلمان بن کر تمہارے درمیان اتار رہے ہیں۔'

کمرے میں سناٹا پھیل گیا ہے۔ جیسے ہزاروں کی تعداد میں سانپ مجھے ڈس رہے ہوں...... میں بے جان آواز میں پوچھتا ہوں......

'اجے سنگھ تھاپڑ۔لیکن تم یہ سب کیوں کر رہے ہو......؟'

دوخوفناک آنکھیں نفرت سے میری طرف دیکھ رہی ہیں—

'تو سنو ارشد پاشا—اس کا جواب بھی سن لو—ہم تم میں گھل مل رہے ہیں...... جیسے دودھ میں پانی گھل مل جاتا ہے—کیا دودھ میں پانی دیکھ سکتے ہو تم......؟ ہم تم میں ایسے ہی گھل مل جائیں گے کہ تم اپنوں کی شناخت بھی نہ کر سکو۔ ہر جگہ ہر موڑ پر—ہم تمہارا سایہ بن کر ساتھ ساتھ چلیں گے—تم ہمیں پہچان بھی نہیں سکو گے اور ہم تمہارا آسانی سے شکار کر سکیں گے......'

تھاپڑ کی آنکھوں میں اپنائیت لوٹ آئی تھی۔

'ڈرومت۔جیسے تمہیں یہاں باعزت لایا گیا ہے۔ویسے ہی ہم تمہیں یہاں سے باعزت باہر بھی نکالیں گے۔اور ہمیں تم سے کوئی ڈر کوئی خطرہ نہیں ہے—دو باتیں ممکن ہیں۔یا تو تم باہر کے لوگوں کو یہ باتیں بتاؤ گے۔یا نہیں بتاؤ گے۔نہیں بتاؤ گے، اس کی امید زیادہ ہے۔کیونکہ کاشی سے دلی تک تم میں ایک نپنسک صحافی کو دیکھا ہے میں نے۔اس صحافی کے پاس قلم بھی نہیں ہے۔اور اگر تم بتاؤ گے تب بھی، ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔کسے بتاؤ گے؟ کس کس کو بتاؤ گے۔ممکن ہے تم جسے بتا رہے ہو، وہ

ہمارا ہو۔ تمہارے مذہب میں ہمارا ہوا......

اس بار تھاپڑ نے تیز ٹھپا کا لگایا تھا۔ اور اس لمحے اس میں پرانا والا تھاپڑ زندہ ہو گیا تھا—

(۹)

قارئین،

میں ارشد پاشا...... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ان حقائق کو قلمبند کرنے کے بعد بحر اوقیانوس کی تہہ میں ڈال دیتا۔ یا نذر آتش کر دیتا— لیکن تھاپڑ کے اس چیلنج صحافی کے لیے ایک سادہ لوح امید کی پرورش کرنا نسبتاً زیادہ آسان تھا۔

قارئین، کہانی یہاں اپنے انجام کو نہیں پہنچی، بلکہ سچ پوچھیے تو کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب......

تھاپڑ کے قید خانے سے باہر نکلا تو شام کی پرچھائیاں مسلط ہو چکی تھیں۔

میں بھاگ رہا تھا......

جیسے ہزاروں کی تعداد میں آسیب میرے پیچھے پڑے ہوں......

میں بھاگ رہا تھا......

اور شاید اس لمحے کے احساس کو میں کوئی نام نہ دے پاؤں۔ میری روح زخمی تھی۔ جسم میں خون کا نام و نشان نہیں۔ آنکھیں خیرہ۔ ہونٹ گویائی سے محروم ...... لیکن

ان سب کے باوجود میں بھاگ رہا تھا...... میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ میں زندہ ہوں۔ میرے لفظ گم تھے۔ یا گم کر دیے گئے تھے—

میں کب اس بھیڑ میں شامل ہوا مجھے خود بھی نہیں پتہ چلا۔ اور میں کس ارادے کے تحت اس بھیڑ کا حصہ بنا، مجھے یہ بھی نہیں معلوم...... میرے قدم بٹلہ ہاؤس چوک کی جانب کیوں بڑھے، میں یہ بھی بتانے کے لائق نہیں—

وہاں دور تک سر ہی سر تھے۔ یہ پورا علاقہ پولس چھاؤنی میں تبدیل کیا جا چکا تھا— اور پولس وہاں پہنچنے والی ہزاروں کی بھیڑ کو روک پانے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی— مجھے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ مغرب تک لاش کی تجہیز و تکفین روک دی گئی— میر صاحب اور ان کے رفقاء کو حکومت کے فیصلے کا انتظار تھا۔ لاش کے لیے برف کی بڑی بڑی سلیاں منگوائی گئی تھیں— مختلف چینلس والوں کے کیمرے لگے تھے— فلیش چمک رہے تھے۔

بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی—

یہ اطلاع بھی مجھے مل گئی تھی کہ حکومت کی مختلف پارٹیوں کے ساتھ میٹنگس سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا— حکومت کوئی بھی سخت قدم اٹھا سکتی تھی۔ مگر سخت قدم اٹھا کر مسلم ووٹ بینک کو کھونے کی حماقت نہیں کرنا چاہتی تھی—

میر صاحب تقریر کر رہے تھے— تقریر کے درمیان ہزاروں کی بھیڑ زور سے نعرے لگاتی......

نعرۂ تکبیر...... اللہ ہو اکبر......

نعرۂ تکبیر......

بھیڑ میں جگہ بناتا ہوا اچانک میں ٹھہر جاتا ہوں...... میرے لیے یقین کرنا
مشکل تھا کہ رباب یہاں بھی آسکتی ہے...... بھیڑ میں جگہ بناتا ہوا رباب کی طرف بڑھتا
ہوں۔ اس کے ہاتھوں میں اسامہ کی تصویر ہے۔ آگے بڑھ کر میں آہستہ سے اس کا ہاتھ
تھامتا ہوں......

'تم......؟'

'یہاں بہت سے لوگ ہیں، جن کے بچے بچھڑ گئے ہیں...... وہ دیکھو...... ماں
باپ اپنے اپنے بچوں کی تصویریں لے کر آئے ہیں۔ انہیں تلاش کرنے......'

'چلو یہاں سے......'

'لیکن کیوں......؟'

رباب میری آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔ میں اس سے کیا کہوں...... کیا
جواب دوں...... کس پر بھروسہ کروں...... اور کس پر بھروسہ نہ کروں...... میں اس لمحے بھی
تھاپڑ کی آواز کی زد میں ہوں...... ہم تم میں گھل مل رہے ہیں...... جیسے دودھ میں پانی
گھل مل جاتا ہے...... کیا دودھ سے پانی کو الگ کر سکتے ہو تم؟ ہم تم میں ایسے ہی گھل مل
جائیں گے کہ تم اپنوں کی شناخت بھی نہ کر سکو گے...... ہم تمہارا سایہ بن کر تمہارے
ساتھ ساتھ چلیں گے...... تم ہمیں پہچان بھی نہ پاؤ گے...... اور ہم تمہارا آسانی سے شکار
کر سکیں گے......

'کیا سوچنے لگے؟' رباب پوچھ رہی ہے —

شاید اس وقت میرے پاس رباب کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں —

رباب کا ہاتھ تھامے میں ہزاروں کے اس مجمع سے دور نکل آیا ہوں —

●●

رات ہو گئی ہے۔ میں خاموشی سے بالکنی پر نکل آیا ہوں —

مجھے نہیں معلوم کہ حکومت نے کون سا راستہ اختیار کیا...... بلغہ ہاؤس چوک پر
کیا ہوا — بغاوت کس طرح آگے بڑھی — یا بغاوت کچل دی گئی — میں یہ بھی نہیں سوچنا
چاہتا کہ ان بغاوتوں سے امید و یقین کے راستے پیدا بھی ہوتے ہیں یا نہیں —

میں اس وقت کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا......

آسمان پر تاروں کا رقص جاری ہے...... اور مجھے اس بات کا یقین کہ یہ کہانی
ابھی اپنے انجام کو نہیں پہنچی — بلکہ یہ کہانی ابھی ابھی شروع ہوئی ہے —

نقش گر حادثات......

اوّل و آخر فنا ، باطن و ظاہر فنا

نقش کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ موسم خوشگوار نہیں تھا۔ سامنے تاحد نظر سرخی مائل آسمان اور یہاں دور تک بھوری مٹی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ — یہ بڑی سڑک، سڑک کے درمیان سے گزر کر شاہراہ سے مل جاتی تھی۔ ذرا دور پر کچھ مکانات تھے جو تباہ ہوچکے تھے۔ ہمیں بتایا جا چکا تھا کہ سرنگیں پھٹنے کی وجہ سے ان مکانوں کی بنیاد کمزور پڑ گئی تھی۔ اور پھر کچھ ایسے خستہ مکانات تھے جو اپنے ہی بوجھ کو سہہ نہ سکے اور مٹی کا ڈھیر بن گئے۔ بڑے بڑے پتھر اکھڑے ہوئے درختوں کے درمیان پڑے تھے۔ دائیں بائیں طرف کی زمین بنجر پڑی تھی۔ یہاں نہ فصلیں جگمگا رہی تھیں اور نہ مکانات ہی تھے......

میں، ارشد پاشا...... میں خود نہیں جانتا کہ اب میری منزل کہاں ہے—؟ مگر میں واقعات کی یورش سے گھبرا کر تلاش و جستجو کے امکانات کو ختم کرنے کا قائل نہیں تھا۔ کوئی آواز تھی جو مجھے آگے بڑھنے کو مجبور کررہی تھی......

سلسلۂ روز و شب ، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب ، اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب ، تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات ، اپنی قبائے صفات

گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ درختوں کے نہ ختم ہونے والے جھرمٹ

[illegible]

آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ میر صاحب کی تحریک پھسڈی نکلی اور میر صاحب کو منانے میں حکومت کامیاب ہوگئی۔ یہ بھی کہا جانے لگا تھا کہ آگے آنے والے وقت میں میر صاحب کو راجیہ سبھا کا ٹکٹ دیا جاسکتا ہے — اجیت سنگھ تھاپڑ کے بیانات اخباروں میں آنے لگے تھے۔ اور یہ بیانات مسلم دشمنی کو ہوا دینے والے تھے— لیکن کبھی کبھی یہ بیانات چونکا بھی دیتے تھے — جیسے عید کے موقع پر اجیت سنگھ تھاپڑ کا عیدگاہ جانا اور اپنے دوستوں کو مبارکباد دینا۔ اور کبھی ٹھہر کر ایسے بیانات بھی آجاتے کہ ہم ان مسلمانوں کے خلاف نہیں ہیں جو حقیقت میں اس ملک کے وفادار ہیں— لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ میں اس چہرے کو بھول نہیں سکا جو کاشی سے دلی کی سڑکوں تک میرے ساتھ تھا۔

سلسلۂ روز و شب ، نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب ، اصل حیات و ممات

گاڑی آگے بڑھ رہی تھی...... دور دھوئیں، مٹی کے سیاہ بادل آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے...... کھنڈرات کے آس پاس خاردار جھاڑیوں کی بار تھی۔ اور ان پر چھتنار درختوں کا سایہ کیا ہوا تھا۔ آگے کچھ مزدور نظر آرہے تھے جو شاید سرنگیں کھود رہے تھے...... کانوں میں کہیں شمیمہ کی آواز گونجتی ہے۔

'بھائی نہیں آئیں گے......؟'

رباب کی آواز ابھرتی ہے۔ کیوں نہیں آئیں گے......

میری آنکھیں دونوں کو دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ رباب خاموشی سے میری آنکھوں میں جھانکتی ہے، جیسے پوچھ رہی ہو۔

'کیا سچ مچ اب کچھ نہیں ہوسکتا......'

'کیوں نہیں ہوسکتا۔'

'کچھ دنوں کے لیے آفس سے چھٹی لے لیجیے۔'

'میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'

رباب کی آنکھوں میں آنسو جھلمل کر رہے تھے۔

'اپنے بچے کو بھولنا آسان نہیں ہوتا۔ کوشش کرتی ہوں۔ خود کو مضبوط کرنے کی۔ لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی۔ میرا دل کہتا ہے، ایک دن وہ واپس لوٹ آئے گا — اچانک سے میرے سامنے کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا — دیکھو ممی میں یہاں ہوں...... پھر تو میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ کہیں بھی جانے نہیں دوں گی۔ زمانہ اتنا بھی برا ہوسکتا ہے، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی......'

رباب پلٹ کر شمیمہ کی طرف دیکھتی ہے۔ آنسو خشک کرتی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہے...... شمیمہ کا ساتھ نہ ملا ہوتا تو سچ مچ ٹوٹ گئی ہوتی۔

دھند میں شمیمہ کی آواز ابھرتی ہے۔

'بھائی آجائیں گے......'

'مگر کب......؟'

میں خود سے سوال کرتا ہوں مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ جواب جیسے سیاسی حالات کی دھند میں گم ہو چکے ہیں......

میرے لیے یعنی ایک باپ کے لیے یہ سوچنا بھی مشکل تھا کہ اس کا بیٹا ایک گمشدہ ماضی کا حصہ ہے۔ میں اسامہ کی تلاش کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا اور کہا جاسکتا ہے کہ اب یہ تلاش ہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ اس درمیان اسامہ کے

بارے میں دو خبریں ملی تھیں۔ اس بار بھی وہ مندروں میں ہی دیکھا گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے دیکھا تھا، انہوں نے بتایا کہ وہ وہاں سے بھی جا چکا ہے — اور اس لیے میری تلاش کے راستے بھی بند ہو چکے تھے — سلسلۂ روز وشب...... نقش گر حادثات...... لیکن اس دن اگر دشینت نہیں آتا تو شاید میں روز وشب کے سلسلے میں اسے اپنی یادوں کا حصہ بنا کر بھول بھی چکا ہوتا۔ مگر دشینت کی اچانک آمد نے ایک بار پھر مجھے نئے سفر کے لیے آواز دی تھی......

تم ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

جب موت ہی حاصل ہے تو زندگی سے گھبرانا کیسا۔ موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات......

اس دن صبح کے گیارہ بجے ہوں گے......

••

دروازے پر دستک کے ساتھ ہی میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ سامنے دشینت کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت وہ وردی میں نہیں تھا۔ اکیلا تھا۔ رباب اور شمیمہ میرے پیچھے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، رباب نے غصے سے پوچھا۔

'اب کیا لینے آئے ہو......'

دشینت نے زور کا قہقہہ لگایا—— [illegible]
بھابھی جی—— ہم کوئی دروازہ ایک بار دیکھ لیتے ہیں تو [illegible]
بے شرم ہیں بھابھی جی۔'

'کیا بات ہے......' میں دشینت کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

دشینت کسی ظالم وجابر سلطان کی طرح ہنس رہا تھا—— فیصلہ کیا ہارے،
تمہاری تو جان بچ گئی ملاجی...... ہے...... نا...... میں بول کر گیا تھا کہ اگر فیصلہ
تمہارے حق میں آیا تو علوی مارا جائے گا—— بولا تھا نا ملاجی...... اچھا ہوا یہ فیصلہ
ہمارے حق میں آیا۔ اسے آنا بھی تھا۔'

اب اس کے چہرے پر اچانک ایک سفاک مسکراہٹ طلوع ہوئی تھی۔

'لیکن اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ بچ گئے ہو ملاجی...... خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ جب
بھی کوئی مصیبت آئے گی ہم اس گڑے مردے علوی کو نکال لیں گے—— اور تب
گواہ تم رہو گے ملاجی—— چائے نہیں پلاؤ گے......؟' وہ ہماری بے بسی دیکھ کر ہنس
رہا تھا۔ دراصل ہم تمہیں کبھی محفوظ نہیں ہونے دیں گے ملاجی—— اور گڑے مردے
رکھے کس لیے جاتے ہیں—— اب دیکھو نا یہی تو پالٹکس ہے ملاجی۔ سرکار خطرے
میں ہوتی ہے تو گڑا مردہ لاتی ہے یا نہیں...... ارے وہی تمہارا پاکستان...... جنگ
کے ماحول......'

'پاکستان میرا نہیں ہے——' میں زور سے چیخا۔ 'پاکستان سے میرا کوئی
تعلق نہیں ہے۔ یہ تمہارے اندر کا زہر ہے، جو تم بار بار ہم پر اگلتے رہتے ہو......'

'ناراض کیوں ہوگئے ملاجی——' دشینت ہنس رہا تھا۔ آپ گواہ ہو
ہمارے۔ بلڈ پریشر بڑھ جائے گا تو ہماری پریشانی بڑھ جائے گی۔ چلتا ہوں......'

شمیمہ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا۔

ذاکر نائیک [illegible] میں ڈوب گیا تھا—— انہیں کون پالتا ہے—— کیا وہ حکومت،
جس پر ہم بھروسہ کرتے ہیں...... آنکھوں میں ایک بار پھر ہزاروں تصویریں زندہ
ہوگئی تھیں...... ہر بار جب زندگی کو ٹھہراؤ کا احساس ہوتا ہے، کوئی نہ کوئی واقعہ خوف
کا انجکشن لگانے میں کامیاب ہوجاتا...... سلسلۂ روز وشب نقش گر حادثات......

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ایک ایسے ملک میں پلیں بڑھیں جہاں
تحفظ کے امکانات ہوں۔ وہ ایک ایسے ملک میں سانس لیں جو عدم مساوات سے
کمزور نہ پڑگیا ہو۔ جسے جھلستی ہوئی زمین کی تخریبی طاقت سے خطرہ لاحق نہ ہو......

دشینت کے آنے کے دوسرے ہی دن تھانے سے فون آیا تھا۔

'ایک مخدوش لاش آپ کا انتظار کررہی ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کا بیٹا ہو۔'
میں نے پہلی بار مضبوط آواز میں کہا تھا۔ میرا بیٹا اتنی جلد مر نہیں سکتا۔ بہتر
ہوگا اگر آپ اسے زندہ بچوں میں تلاش کریں۔'

اس رات میں فیصلہ لے چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے—— مجھے حمید قادری
سے ملنا تھا جو سپریم کورٹ کے سینئر ایڈوکیٹ تھے—— اور زیادہ تر غریب مسلمانوں
کے کیس لڑتے تھے۔ وہ قانونی داؤ پیچ کے ماہر تھے اور کئی بڑے مقدمے جیتے تھے
جس کی تعریف اخباروں نے بھی کی تھی۔ پانچ سال قبل وہ حج کے لیے گئے تھے
اور وہاں سے واپس آنے کے بعد زیادہ تر ایسے کیس اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے
جہاں اقلیتوں پر ظلم ہوا تھا...... میں نے حمید قادری سے اپنے بیٹے کے بارے میں
بات کی تھی اور انہوں نے ملنے کا وقت طے کردیا تھا۔

●●

چائے کم ہو چکی تھی۔ حمید قادری میز کے دوسری طرف ریوالونگ چیئر پر بیٹھے تھے۔ شیشے کے ریک سے قانون کی کتابیں جھانک رہی تھیں۔

وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ 'یہ جاننا ضروری ہے کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟'

'کیا اس سسٹم میں ہمیں اسی طرح جینا ہوگا — ؟'

'نہیں۔'

'پھر مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا اپنے بیٹے کو بھول جانا چاہئے — ؟'

'نہیں — ' وہ آہستہ سے بولے — 'بیٹے کا درد کیا ہوتا ہے، میں جانتا ہوں، میں نے ایک جوان بیٹا کھویا ہے۔'

'کیا پولس اور انتظامیہ کے خلاف مقدمہ نہیں کیا جاسکتا — میری رگوں میں خون جوش مار رہا تھا۔ ایک معصوم بچہ پولس ظلم کا شکار ہو کر گم ہو جاتا ہے۔ اور پولس اسے تلاش کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھاتی۔'

'پھر ہمیں بھی جیل جانے کا انتظار کرنا چاہئے۔ کیوں؟'

'میں نے ایسا نہیں کہا۔ لیکن یہ جنگ اب مشکل ہوتی جا رہی ہے۔'

حمید قادری نے میز پر پڑی ہوئی فائلوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک فائل نکالی۔ دیر تک فائل کو دیکھتے رہے۔ پھر نظر اٹھا کر بولے —

'کس حکومت کو سیکولر کہیں گے اور کس حکومت کو کمیونل؟ مغربی بنگال چلے جایئے وہاں ہر چوتھا آدمی مسلمان ہے اور ان کی آدھی جیلیں مسلمانوں سے بھری ہوئی ہیں۔ مہاراشٹر میں ہر تیسرا اور اتر پردیش میں ہر چوتھا قیدی مسلمان ہے......'

وہ ہنس رہے تھے — ابھی حکومت کو مسلمانوں کے لیے مزید جیلیں بنانی پڑیں گی...... اور مقدمہ کریں گے آپ......؟ وہ ہنس رہے تھے...... ہمیں اقلیت

کہا جاتا ہے جب کہ جیلوں میں ہم اکثریت میں ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے سوچا ہے کہ وہ جیلوں سے باہر کیسے آئیں گے — یہ فائل دیکھیے۔ یہاں جتنی بھی حکومتیں ہیں، سب کی سب مسلمانوں کو سزا دلانے میں آگے ہی آگے ہیں — قیدیوں کو تو یہ بھی نہیں پتہ کہ قانونی مدد کیسے لی جاتی ہے۔ نہ انہیں یہ پتہ ہوتا ہے نہ انہیں وکیل مہیا کرایا جاتا ہے۔ اور نہ ان کے پاس اپنے مقدمے لڑنے کے لیے پیسے ہوتے ہیں۔'

حمید قادری کی آواز بھاری ہوگئی تھی — پولس میں، فوج میں مسلمان کہیں بھی نہیں ہیں۔ دلی پولس کی بات کیجیے تو بس دو فیصد مسلمان ہیں۔ ہزاروں بے جرم، بے قصور جیلوں میں قید ہیں اور سیکولرزم کی دہائی دینے والی حکومتیں خاموش ہیں۔ کس پر بھروسہ کریں گے آپ؟ آپ کی سچر کمیٹی نے ہی کہا تھا کہ مسلمان کہیں سب سے زیادہ ہیں — تو وہ جیلوں میں ہیں — اور کیا ہوتا ہے ان سفارشات کا — یہ صرف سوال اٹھا کر آپ کو رنجیدہ کر جاتے ہیں — اور اس سے آگے نہ حکومت کے پاس وقت ہے نہ اپازیشن کی اس معاملے میں دلچسپی۔ یہ قصور آپ کا ہے کہ آپ محض ووٹ بینک بن چکے ہیں۔'

میری آواز سرد تھی...... یہاں میں صرف اپنے بیٹے کے بارے میں جاننے آیا ہوں...... آواز درد میں ڈوب گئی تھی...... لیکن آپ جو بتا رہے ہیں تو پھر...... ہم آزاد کہاں ہیں......؟

'آزاد......' حمید قادری نے زور سے ٹھہا کا لگایا — 'بند کمروں میں ہنس سکتے ہیں، نوکری کے لیے اپلائی کر سکتے ہیں۔ حکومت کو گالی دے سکتے ہیں۔ یہاں تک آزاد ہیں ہم اور اس کے بعد کا راستہ جیلوں کی طرف جاتا ہے۔ میں اسی لیے ایسے لوگوں کے کیس لینے لگا کہ اپنی زندگی کو کوئی مقصد تو دے سکوں۔ ایک بڑی

[illegible]

اگر پولس اور قانون پر زیادہ دباؤ بنائیں گے تو وہ [illegible] آپ کو بھی جیل میں ڈال دے گی۔ پھر کیا کریں گے۔'

آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی ہے۔ یہاں تو میں اپنے سوالوں کا جواب تلاش کرنے آیا تھا لیکن یہاں بھی ناامیدی کا نہ ختم ہونے والا ریگستان ہے۔ ایک طرف رباب ہے جس کی آنکھیں اسامہ کے انتظار میں پتھر کی ہو چکی ہیں۔ دوسری طرف اسامہ ہے جس کے بارے میں محض خبریں ملتی رہتی ہیں اور کوئی بھی یہ وثوق کے ساتھ بتا نہیں پاتا کہ وہ کہاں ہے اور کہاں ملے گا۔ اور ان سے الگ ہزاروں معصوم بچے ہیں جو جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور بقول حمید قادری، مسلمان گھروں میں کم جیلوں میں زیادہ ہیں۔ پھر کیا کریں گے ہم...... کیسے واپس آئے گا اسامہ......

یا پھر...... اسامہ کی گمشدگی کو جمہوریت میں ہونے والا ایک معمولی حادثہ سمجھ کر مجھے بھول جانا ہوگا۔

لیکن کیا بھولنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے......؟

میری آواز گم ہو رہی ہے۔ چہرے پر لکیریں ابھر رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں، حمید قادری کی گہری آنکھیں میری آنکھوں میں اتر گئی ہیں——

حمید قادری نے میری طرف دیکھا—— مجھے آپ کے بیٹے سے اور آپ سے ہمدردی ہے۔ بس یہ دعا کیجئے کہ وہ زندہ ہو۔ اور اگر خدانخواستہ جیل میں ہو...... قادری نے سر جھکا لیا—— تو اس کے جینے کی دعا نہ کیجئے گا۔ ایک گھٹن بھرے قید خانے میں ذلت اور عذاب کے درمیان جوانی گزر جائے، اس سے بہتر موت

ہے...... آپ صرف ایک کام کر سکتے ہیں...... اسے تلاش کرنا نہ چھوڑیے......'

آنکھیں دھند میں اتر گئی ہیں۔

چاروں طرف دھند ہی دھند۔

لیکن اب اس دھند اور تاریکی میں مجھے راستہ تلاش کرنا تھا اور میں اس کا عزم کر چکا تھا——

گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ تبدیلیاں، انقلاب، گولہ باری، دھماکہ...... سب جیسے بے معنی خلاء میں گم ہو چکے تھے۔ جنگلات پیچھے رہ گئے تھے۔ گاڑی سرنگ سے باہر کھلے میدان میں نکل آئی تھی...... ایک ڈھلوان میدانی نشیب سے ابھر کر دور وسیع پہاڑیوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ سڑک کے اس طرف بل کھاتی زمین سے آگے زرد سا بادل آدھے آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ ڈرائیور نے پلٹ کر میری طرف دیکھا...... لیکن میری آنکھیں کہیں اور ہی دیکھ رہی تھیں......

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات، کار جہاں بے ثبات
اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو، منزل آخر فنا

'آگے سڑک ٹوٹی ہوئی ہے۔' ڈرائیور نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔

اور آگے دھماکے بھی ہو رہے ہیں......'

دھماکے ہوتے رہتے ہیں — چٹانیں ٹوٹ رہی [illegible] کی [illegible] بھی [illegible]
۔ بہت سارے مزدور کام کررہے ہیں...... اور مزدوروں میں ہی......
مجھے بلایا گیا تھا — ایک بچہ ہے جس کی شکل اسامہ سے ملتی جلتی ہے......

ایک دھماکہ ہوا تھا...... آگے کچھ فاصلے پر کچھ لوگ نظر آرہے تھے...... کچھ حرکتیں تھیں۔ اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے لوگ تھے۔ کھلا میدان تھا — اور پیڑوں کی قطار کے پاس پھاوڑے لیے زمین کھودتے ہوئے کچھ مزدور اپنا کام کررہے تھے۔ ذرا فاصلے سے آتی ہوئی دھماکوں کی آوازیں اب قریب آگئی تھیں — گاڑی کے شیشے گرا دیے گئے تھے — آخر اس پوری تلاش کا مقصد کیا تھا —؟ ہم کیوں تلاش کرنے نکلے تھے؟ کنزیومر ورلڈ...... گلوبل وارمنگ کے اس عہد میں، ایک بے حد مہذب دنیا میں — جس کے ختم ہونے کی پیش گوئی سے ساری دنیا ڈری ہوئی ہے۔ جہاں ہالی وڈ ۲۰۱۲ جیسی خوفناک تباہی کے مناظر کو کمزور انسانی آنکھوں کے سامنے رکھتی ہے۔ وہیں ایک دوسرا فلمساز ایک نوجوان لڑکی اور ویمپائر کی انوکھی محبت کو دکھا کر داد تحسین وصول کرتا ہے — ایک ختم ہوتی ہوئی دنیا اور ایک ویمپائر کی محبت — والیٹر نے کہا تھا — خدا نہیں ہوتا تو ہم اسے بنا لیتے۔ محبت نہیں ہوتی تو...... ہم اسے بنا لیتے —؟ بے رحم پیش گوئیوں کے درمیان انسانی محبتیں بھی اب خون چوسنے والے ویمپائر کے پاس گروی پڑی ہیں......

ڈرائیور نے زور سے بریک لیا — کچھ چیختے ہوئے لوگ میری گاڑی کی طرح سرعت سے بڑھے تھے۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے — ان کے

پڑے [illegible] رنگ کے تھے — سر پر پیلے رنگ کے ہیٹ تھے — آگے درختوں
[illegible] چاروں طرف [illegible] زون کے بورڈ آویزاں تھے —

ہم گاڑی سے اتر آئے۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہے تھے...... 'یہاں چاروں طرف ڈینامائٹ بچھا ہے — راستہ بند ہے۔ چار دن پہلے سے ہم نے لاؤڈ اسپیکر پر آس پاس کے تمام گاؤں میں اعلان کرا دیا تھا — ابھی دو دن پہلے پانچ اسکول کے بچوں کی موت ہوگئی — اور صبح بھی کچھ باہری لوگ...... وہ دیکھیے......'

دوسرا آدمی بھدی بھدی گالیاں دے رہا تھا...... ڈرائیور کے چہرے پر ناامیدی اور غصے کا ملا جلا رنگ غالب آگیا تھا — میں ان مزدوروں کی گالیوں سے پریشان تھا۔ میں سمجھانا چاہتا تھا — 'گالی مت دو...... کچھ گم ہوگیا ہے۔ ہم کسی کی تلاش میں آئے ہیں۔ یہاں اکثر کچھ نہ کچھ گم ہوجاتا ہے۔ تلاش تو کرنا پڑتا ہے نا......؟ میں اسے ملک کی جمہوریت کی باتیں سمجھانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ چیخ رہے تھے۔

'یہاں قبریں کھدرہی ہیں۔ وہ دیکھو......'

پانچ چھ مزدور، ہاتھ میں پھاوڑا لیے گڈھا کھودنے میں لگے تھے...... پیڑوں کے درمیان سے آگے دور تک پہاڑوں اور چٹانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آرہا تھا......

اچانک ہوا ایک بار پھر تیز ہوگئی تھی۔ سرد لہر جسم میں اترتی جارہی تھی...... چاروں طرف ڈینجر زون اور 'خطرہ ہے' کے بورڈ کے درمیان جیسے ہم بے بس کھڑے تھے — لاؤڈ اسپیکر پر چٹان کے گرائے جانے کی وارننگ دی جاچکی

تیز آواز— لڑھکتی گرتی چٹانیں— دھماکے— [illegible] پہاڑ چھوڑتے— گڑھا کھودتے مزدور......

ہمیں وارننگ دی جارہی تھی......

''آپ لوٹ جائیے۔ سنبھل کر جائیے— آپ آگے نہیں جاسکتے— کسی سے مل نہیں سکتے— یہاں تو روز ہی کسی نہ کسی کی جان جاتی ہے۔ روز ہی گڈھا کھونا پڑتا ہے......''

چٹانوں کے گرنے لڑھکنے کا سلسلہ جاری ہے...... آسمان زردی مائل ہوچکا ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھالی ہے۔ فضا میں تیز دھماکے گونج رہے ہیں...... لہراتے ہوئے دھوئیں کا غبار یہاں سے صاف نظر آرہا ہے...... اور— میرے اندروہی نغمہ گونج رہا ہے......

سلسلۂ روز و شب ، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب ، اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب ، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات ، اپنی قبائے صفات

—— مسلسل

مشرف عالم ذوقی کی کچھ اور نئی کتابیں

- ملک بدر (ناول)
- اردو (ناول)
- سرحدی جناح (ناول)
- اڑنے دو ذرا (ناول)

زیر اہتمام

ساشا پبلیکیشنز

D-304 تاج انکلیو، لنک روڈ، گیتا کالونی دہلی-110031

Aatishe Raftaa Kaa Suraagh

(NOVEL)

by

Musharraf Alam Zauqi

”میں نے ابھی ابھی اس ناول کو ختم کیا ہے۔ اور میں ابھی بھی اس کے سحر میں گم ہوں۔ کہنا مشکل ہے کہ اس ناول کے سحر سے کب باہر نکل سکوں گا۔ اس ناول کو لکھنا آسان نہیں تھا۔ پاکستان میں ہم ایسے ناولوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مجھے نہیں خبر کہ آپ کو اس کے لکھنے کا حوصلہ کہاں سے ملا۔“

—یونس خاں (پاکستان)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-114-7

مشرف عالم ذوقی کی کچھ اور نئی کتابیں

- ملک بدر (ناول)
- اردو (ناول)
- سرحدی جناح (ناول)
- اڑنے دو ذرا (ناول)

زیر اہتمام

ساشا پبلیکیشنز

D-304 تاج انکلیو، لنک روڈ، گیتا کالونی دہلی-110031

آتش رفتہ کا سراغ | 720